ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان



سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

- شہادت علی الناس (امت وسط کی ذمہ داری)
  سید جلال الدین عمری
- عربی زبان میں خودنوشت سوانح نگاری کا ارتقاء
  ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی
- اسلامی تناظر میں مالیاتی پالیسی
  ڈاکٹر اوصاف احمد
- تحریکِ آزادی میں فتاویٰ کا کردار
  پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی
- مولانا گوہر رحمٰن کی علمی خدمات: ایک جائزہ
  جناب غلام حسین بابر
- نظم قرآن: شاہ ولی اللہ اور مولانا مودودی کے نظریات
  پروفیسر احتشام احمد ندوی
- تبصرے

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۱

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جولائی ـــــــــــــــــــ ستمبر ۲۰۰۸ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

پان والی کوٹھی، دودھ پور، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۱

Email: tahqeeqat_islami@yahoo.com, tahqeeqateislami@gmail.com

Website: www.tahqeeqat-e-islami.co.in

سہ ماہی **تحقیقاتِ اسلامی** علی گڑھ

جلد: ۲۷ شمارہ: ۳

رجب ——— رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ

جولائی ——— ستمبر ۲۰۰۸ء

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۲۵ روپیے
سالانہ	۱۰۰ روپیے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۱۲۵ روپیے

بیرونِ ملک

سالانہ (انفرادی)	۴۰۰ روپیے
سالانہ (ادارے)	۶۰۰ روپیے

پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰۰ روپیے
سالانہ (ادارے)	۳۰۰ روپیے

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

شہادت علی الناس (امت وسط کی ذمہ داری) — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

عربی زبان میں خودنوشت سوانح نگاری کا ارتقاء — ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی — ۱۹

بحث ونظر

اسلامی تناظر میں مالیاتی پالیسی — ڈاکٹر اوصاف احمد — ۴۳

تحریکِ آزادی میں فتاویٰ کا کردار — پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی — ۵۵

سیر وسوانح

مولانا گوہر رحمٰن کی علمی خدمات: ایک جائزہ — جناب غلام حسین بابر — ۸۱

نقد واستدراک

نظم قرآن کے بارے میں

شاہ ولی اللہ اور مولانا مودودی کے نظریات — پروفیسر احتشام احمد ندوی — ۱۰۰

تعارف وتبصرہ

سنتوں کا تنوّع - ہر سنت نبوی افضل ہے — مولانا مجاہد شبیر احمد فلاحی — ۱۰۴

تعمیر معاشرہ اور مساجد — مولانا سراج احمد برکت اللہ فلاحی — ۱۰۹

عصر حاضر میں اسوۂ رسول کی معنویت — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۳

کاروان رفتگاں — ” ” — ۱۱۵

خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی (۲۸) — ۱۱۷

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

سکریٹری ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ، لیکچرر اجمل خاں طبیہ کالج ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۲۔ ڈاکٹر اوصاف احمد

مدیر سہ ماہی مطالعات، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی، سابق صدر شعبۂ کار خاص، اسلامی ریسرچ وٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، اسلامک ڈیولپمنٹ بینک، جدہ

۳۔ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

صدر ادارۂ علومِ اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، سکریٹری ادارۂ علوم القرآن، علی گڑھ

۴۔ جناب غلام حسین بابر

لیکچرر بارانی زرعی یونی ورسٹی، راولپنڈی، پاکستان

۵۔ پروفیسر احتشام احمد ندوی

مدینہ منزل، نیو سرسید نگر، علی گڑھ (سابق صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی)

۶۔ مولانا مجاہد شبیر احمد فلاحی

اسکالر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۷۔ مولانا سراج احمد برکت اللہ فلاحی

اسکالر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۸۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۹۔ سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

شہادت علی الناس

(امت وسط کی ذمہ داری)

سید جلال الدین عمری

شہادت کے معنیٰ ہیں حاضر اور موجود ہونا، مشاہدہ کرنا، جو کچھ دیکھا اسے ٹھیک ٹھیک بیان کرنا اور گواہی دینا۔

قرآن مجید میں کئی طرح کی شہادتوں کا ذکر ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی شہادت: اس سے مراد ہے اس کا وسیع علم، اس کی پیدا کردہ کائنات اور اس میں موجود آثار وعلامات، جو اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کی شہادت دیتے ہیں۔

۲۔ فرشتوں کی شہادت: فرشتے انسان کے ساتھ ہیں۔ وہ اس کے اعمال کو دیکھتے اور بے کم وکاست انہیں ریکارڈ کرتے ہیں۔ قیامت میں یہی ریکارڈ اللہ کے سامنے پیش ہوگا اور اس کے مطابق فیصلہ ہوگا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی شہادت: اللہ کے رسولوں کی بعثت کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ وہ اس کے دین کے حق ہونے کی شہادت دیں۔

۴۔ اہل ایمان کی عام انسانوں پر شہادت: یہ اسی مقصد کے لئے ہوتی ہے جس مقصد کے لئے پیغمبروں کی شہادت ہوتی ہے۔

۵۔ انسان کے جسم اور اعضاء وجوارح کی شہادت: انسان نے دنیا میں جو اعمال انجام دیے اور جس طرح انجام دیے قیامت کے روز اس کا پورا بدن اور اس کے تمام اعضاء اس کی شہادت دیں گے۔

۶۔ معاملاتِ دنیا کی شہادت۔ اس شہادت کی بنیاد پر انسانی حقوق کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ہر حال میں صحیح شہادت دیتے ہیں اور جن کے دلوں میں خدا کا خوف نہیں ہوتا ان کی شہادت مفادات کے تابع ہوتی ہے۔

اللہ کے رسول اپنی قوموں اور امتوں کے درمیان اس کے دین کی جو شہادت دیتے ہیں اسے 'شہادت علی النّاس' کہا جاتا ہے۔ یہاں اسی کا ذکر ہے۔ رسول خدا ﷺ کا ایک وصف 'شاہد' بھی ہے:

یٰٓاَیُّھا النَبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِداً وَّمُبَشِّراً وَّنَذِیْراً ○ وَدَاعِیاً اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیراً ○	اے نبی ہم نے تم کو شاہد (گواہی دینے والا) خوش خبری دینے اور ڈرانے والا، اللہ کے حکم سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔[۱]
(الاحزاب:۴۵-۴۶)	

شہادت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو آنکھوں سے مشاہدے کے بعد دی جاتی ہے۔ دوسری وہ جس کی بنیاد دلائل اور براہین پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول یہ دونوں طرح کی شہادت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو بعض غیبی حقائق کا اس طرح مشاہدہ کراتا ہے کہ اس میں انہیں کوئی شک وشبہ نہیں لاحق ہوتا۔ وہ اپنے اس یقین کا اظہار واعلان کرتے ہیں اور اس کے حق ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ اس طرح کا مشاہدہ رسول کے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہوتا۔ اس معاملہ میں رسول کے تجربہ اور بیان پر یقین کرنا پڑتا ہے۔

رسولوں کی شہادت کی دوسری قسم یہ ہے کہ وہ دلیل و استنباط کے ذریعہ حق کا اثبات کرتے ہیں۔ وہ اللہ کے عطا کردہ علم و بصیرت، دلائل و براہین، نصح و خیر خواہی اور سیرت و اخلاق کے ذریعہ 'شہادت علی النّاس' کا فرض اس طرح انجام دیتے ہیں کہ دین حق بالکل واضح ہو جاتا اور مخاطب قوم پر حجت تمام ہو جاتی ہے۔ اس کی مخالفت کی کوئی معقول بنیاد باقی نہیں رہتی۔ اس کے باوجود قوم قبولِ حق سے انکار کر دے اور باطل پر جمی

---

[۱] ان دو آیتوں میں سے پہلی آیت، جس میں آپ ﷺ کو شاہد کہا گیا ہے، سورۃ الفتح (آیت ۸) میں بھی آئی ہے۔

رہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ ہو جاتا ہے کہ اب اسے زمین پر زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے جب فرعون اور اس کی قوم پر شہادت کا فرض ادا کر دیا تو اس کی ہلاکت کا فیصلہ ہو گیا اور آخرت میں بھی وہ اللہ کے عذاب میں گرفتار ہوں گے:

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ○ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ○ (المزمل: ۱۵-۱۶)

تم لوگوں کے پاس ہم نے اسی طرح ایک رسول تم پر شہادت دینے والا بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا (پھر جب) فرعون نے اس رسول کی بات نہ مانی تو ہم نے اس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔

اس آیت میں قرآن کے اوّلین مخاطب قریش سے کہا جا رہا ہے کہ فرعون کے سامنے حضرت موسیٰؑ نے دین حق کی شہادت دی اور اب محمد ﷺ تمہارے درمیان شاہد بن کر آئے ہیں۔ خوب سوچ لو، اگر تم نے ان کی مخالفت کی تو اسی انجام سے دوچار ہو گے جس سے فرعون اور اس کی قوم دوچار ہوئی تھی۔

اللہ کے رسول اپنی قوم کے درمیان زندگی بھر اس کے دین کے 'شاہد' بن کر رہتے ہیں۔ اسے راہ حق دکھانے اور ضلالت و گمراہی سے بچانے کی سعی کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں:

وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ○ (المائدہ: ۱۱۷)

(اے اللہ) میں اس وقت تک ان کا گواہ (نگراں) تھا جب تک ان کے درمیان تھا، جب آپ نے مجھے واپس بلایا تو آپ ان پر نگراں تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگراں ہیں۔

یہ شہادت آخرت میں بھی ہوگی، اللہ تعالیٰ اپنے ایک ایک پیغمبر سے پوچھے گا کہ کیا تم نے حق کی شہادت دی؟ ان کا جواب اثبات میں ہوگا کہ انھوں نے اللہ کے دین کو اپنی قوم تک ٹھیک ٹھیک پہنچایا اور حجت تمام کر دی۔ اس کے بعد خدا کے دین کا انکار

کرنے والوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی، وہ کوئی عذر پیش نہ کر سکیں گے۔ اس وقت یہ موقع بھی باقی نہیں رہے گا کہ وہ اپنے رویہ کی اصلاح کر لیں اور اللہ کو راضی کر سکیں، اس لیے کہ مہلت عمل ختم ہو چکی ہوگی اور جزائے عمل آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ سورۂ نحل میں ارشاد ہے:

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْداً ثُمَّ لاَ يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلاَ هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ○ (النحل:۸۴)

اور (سوچو!) جس دن ہم ہر امت سے ایک شہادت دینے والا (پیغمبر) کھڑا کریں گے پھر (یہ ہوگا کہ) جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی انھیں کچھ کہنے کی اجازت ہوگی اور نہ ان سے کہا جائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو خوش کر لیں۔

سورۂ نحل ہی میں چند آیات کے بعد فرمایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی قیامت کے روز شاہد کی حیثیت سے اٹھیں گے اور جس طرح دوسرے رسول اپنی قوموں کے متعلق شہادت دیں گے اسی طرح آپ اپنی قوم کے بارے میں شہادت دیں گے کہ دین حق کے ساتھ ان کا کیا رویہ رہا؟ فرمایا:

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْداً عَلَيْهِمْ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْداً عَلٰى هٰؤُلاَءِ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَاناً لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ○ (النحل:۸۹)

اور (یاد کرو) اس دن کو جس دن ہم ہر امت میں ان ہی میں سے ایک شہید ان کے خلاف کھڑا کریں گے اور آپ کو ان (منکرین) کے خلاف شہید بنا کر لائیں گے۔ ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کی ہے جس میں دین کی ہر بات کی وضاحت ہے۔ یہ سراسر ہدایت اور رحمت ہے اور فرماں برداروں کے لیے بشارت ہے۔

سورۂ نساء میں یہ بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاءِ شَهِيْداًo (النساء:۴۱)

پھر سوچو کہ اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمھیں گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔

صحیح بخاری کی حدیث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو تلاوت کا حکم دیا، انھوں نے سورۂ نساء کی تلاوت کی۔ جب وہ ان آیات پر پہنچے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے اور فرمایا بس کرو۔[1] یہ آنسو اس احساس کی وجہ سے تھے کہ شہادت حق کی کتنی عظیم ذمہ داری آپ پر ڈالی گئی ہے اور اس بنیاد پر بھی تھے کہ شہادت کے بعد بھی آپ کی قوم دین حق کو قبول نہ کرے تو اس کا انجام کتنا بھیانک ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے 'شہادت علی الناس' کا فرض انجام دیا اور امت مسلمہ وجود میں آئی۔ اب یہ اس کی ذمہ داری قرار پائی کہ وہ اس فرض کو تا قیامت انجام دیتی رہے۔ اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنُ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً. (بقرہ:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمھیں امتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں کے سامنے شہادت دو اور رسول تمھارے حق میں شاہد بن جائے۔

آیت کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرتِ مدینہ کے بعد سولہ سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا فرماتے رہے۔ اس کے بعد تحویلِ قبلہ کا حکم آیا اور خانۂ کعبہ قبلہ قرار پایا، جو حضرت ابراہیمؑ اور آپ کے بعد آنے والے تمام نبیوں کا قبلہ تھا۔ اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح صحیح قبلہ کی طرف تمھاری رہنمائی فرمائی اسی طرح یہ اعزاز بھی اس نے تمھیں بخشا ہے کہ دنیا کی تمام امتوں کے درمیان تمھیں 'امت وسط' بنایا ہے۔

'وسط' کے معنی درمیان کے ہیں۔ وسط ایسی جگہ کو کہا جاتا ہے جس کا فاصلہ ہر طرف

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ نساء، باب قولہ فیکف اذا جئنا من کل امة بشهید

سے ایک ہو۔یعنی اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایسی امت بنایا ہے جس کا جھکاؤ نہ دائیں جانب ہے اور نہ بائیں جانب، بلکہ وہ دو انتہاؤں کے درمیان کھڑی ہے۔اسی سے بعض مفسرین نے 'وسط' کا ترجمہ اعتدال کیا ہے۔ جہاں اعتدال ہوگا وہاں کسی معاملہ میں غلو اور انتہا پسندی ہوگی نہ کمی اور کوتاہی۔ ہر ایک کو اس کا صحیح مقام حاصل ہوگا۔حدیث میں 'وسط' کے معنی عدل کے بیان ہوئے ہیں۔ یہ مقامِ وسط کا لازمی تقاضا ہے، جو گروہ کسی کی بے جا طرف داری کرے نہ اس کے ساتھ تعصب برتے وہ اس کے ساتھ ضرور انصاف کرے گا۔اسی وجہ سے امتِ وسط کو اعلیٰ وارفع امت کہا گیا ہے۔قرآن مجید میں اس امت کو 'خیر امت' کے لقب سے بھی یاد کیا گیا ہے۔(آل عمران:۱۱۰)

انسان مادہ اور روح کا مجموعہ ہے۔دونوں کے تقاضے ہیں۔ان میں سے کسی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا،لیکن دنیا ہمیشہ اس معاملہ میں دو انتہاؤں پر رہی ہے۔آج کے دور میں مادیت کا غلبہ ہے۔ مادی آسائش و راحت کو انسان کی زیست کا حقیقی مقصد سمجھ لیا گیا ہے۔ ہر شخص اسی کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ جو اس میدان میں جس قدر آگے بڑھے اسے اتنا ہی کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔اس کے مقابلہ میں رہبانیت کا تصور گو کم زور ہے،لیکن مذہب کی دنیا میں آج بھی ترکِ دنیا کو انسان کی معراج سمجھا جاتا ہے۔راہ اعتدال ان دو انتہاؤں کے درمیان ہے۔امت وسط کو اسی کی طرف راہ نمائی کرنی ہے۔

'امت وسط' کے بارے میں فرمایا گیا 'لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ' یعنی اللہ نے تمھیں امت وسط اس لئے بنایا ہے کہ تم 'شہادت علی الناس' کا فرض انجام دو۔ دنیا میں فکر و عمل کا جو بگاڑ پایا جاتا ہے اس کی نشان دہی کرو اور صراط مستقیم واضح کرو۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو غیر مکلّف نہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ اس پر بڑی ذمہ داریاں ڈالی ہیں۔ان ذمہ داریوں کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنا اور ان سے غفلت اور کوتاہی کے نتائج سے آگاہ کرنا اس امت کا کام ہے۔'شہادت علی الناس' میں نگرانی کا تصور بھی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ امت وسط کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ دیکھتی رہے کہ دنیا کہیں صحیح راہ سے ہٹ تو نہیں گئی ہے اور اس نے غلط طریقۂ حیات تو نہیں اختیار کر رکھا ہے ۔ جس رخ سے بھی بگاڑ پایا جائے

اس کا برملا اظہار و اعلان کرے۔ اس معاملہ میں اسی کی شہادت معتبر سمجھی جائے گی۔ اس لئے کہ وہ جو بات کہے گی عدل و انصاف کے مطابق کہے گی، کسی کے غلط مفادات کے تابع نہ ہوگی۔

شہادت کی بنیاد پر انسان کے حقوق کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں جو فکری اور نظریاتی جنگ چل رہی ہے اس کا فیصلہ بھی اسی وقت ہوگا جب کہ حق کی شہادت دی جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام ہی دین حق ہے۔ اس کے خلاف جو نظریات ہیں ان کی اساس باطل پر ہے۔ اس پہلو سے شہادت کی اصطلاح میں بڑی معنویت ہے۔

'امت وسط' کی ذمہ داری جن الفاظ میں بیان ہوئی ہے، اس سے بعض باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

۱۔ اس امت کا نظریاتی طور پر شہادت کے مقام پر فائز ہونا یا عدل و قسط کا حامل ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ عملاً اسے شہادت کا فرض انجام دینا ہوگا۔

۲۔ اس امت کو علمی اور فکری پہلو سے بھی اس مقام پر ہونا چاہیے کہ وہ ثابت کر سکے کہ اسلام ہی حق ہے اور اس کی مخالفت کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اس کے لئے قرآن نے جو دلائل فراہم کئے ہیں ان سے واقفیت اور ان کو دنیا کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے۔

۳۔ امت کو سیرت و اخلاق کے لحاظ سے صادق، راست باز، حق گو اور عادل و منصف ہونا چاہیے، ورنہ اس کی شہادت کا اعتبار نہ ہوگا۔

۴۔ یہ شہادت کسی خاص طبقہ، جماعت یا ملک و قوم ہی کے درمیان نہیں، بلکہ ساری نوع انسانی کے سامنے دینی ہے اور حق واضح کرنا ہے۔

۵۔ شہادت علی الناس کا فرض کسی خاص دور سے متعلق نہیں ہے، بلکہ اسے ہر دور میں تا قیامت انجام دینا ہے۔

امت وسط کی شہادت کے بعد رسول اللہ ﷺ کی شہادت کا ذکر ہے۔ ارشاد ہے 'لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيداً عَلَيْكُمْ' (تا کہ رسول تم پر شاہد ہو) مطلب یہ کہ اللہ

کے رسول ﷺ شہادت کا فرض تم پر انجام دیں گے، تمہیں راہ حق دکھائیں گے، تمہارے اخلاق وسیرت کی نگرانی کریں گے، تمہیں عدل وانصاف کی خوبیوں سے آراستہ کریں گے اور تمہیں اس قابل بنائیں گے کہ دنیا کے سامنے حق کی شہادت دے سکو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرض انجام دیا اور 'امت وسط' وجود میں آئی۔ اس کی ذمہ داری یہ قرار پائی کہ وہ ساری دنیا کے سامنے حق کی شہادت دے۔

آیت میں پہلے امت کی شہادت کا اور پھر رسول اللہ ﷺ کی شہادت کا ذکر ہے۔ اس میں ایک طرف تو امت کو اس کے عالمی منصب کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور دوسری طرف اس احسان کا ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس کے لئے خدا کی طرف سے شاہد بن کر آئے ہیں۔

سورۂ حج میں بھی یہ آیت آئی ہے۔ اس میں پہلے رسول اللہ ﷺ کی شہادت کا اور اس کے بعد امت کی شہادت کا ذکر ہے۔ ارشاد ہے:

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ	تاکہ رسول تم پر شہادت دینے والا ہو اور تم
وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ.	لوگوں پر شہادت دینے والے ہو جاؤ۔

(الحج:۷۸)

ان الفاظ میں شہادت کا عمل جس ترتیب سے انجام پایا اس کا اظہار ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے امت کے سامنے دین حق کی شہادت دی۔ اس کے بعد امت کو حکم ہوا کہ وہ تمام انسانوں کو اللہ کا پیغام پہنچائے اور اس بات کی شہادت دے کہ اسلام ہی دینِ حق ہے۔

ان آیات میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ شہادت حق کا فرض جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اس امت کے درمیان انجام دیا تھا اسی طرح امت کو دنیا والوں کے درمیان انجام دینا ہوگا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ ہی کا اسوہ اور طریقۂ کار اختیار کیا جائے۔ اس کام میں وہی اخلاص، دردمندی، دل سوزی اور سوز وتڑپ ہونی چاہیے جو آپ کے اندر تھی۔

شہادت کا آغاز آدمی کی ذات سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے ایمان کے اظہار کے

لیے زبان سے شہادت دیتا ہے اور اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کے لیے ایمانِ صادق اور یقینِ کامل شرط ہے۔ نفاق کے ساتھ ایمان کا اعتبار نہ ہوگا۔ منافقین کے بارے میں کہا گیا:

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ ○ (المنافقون:۱)

جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم شہادت دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ یہ منافقین بلاشبہ جھوٹے ہیں۔

منافقین کی شہادت اس لیے معتبر نہیں ہے کہ وہ زبان سے جو کچھ کہتے ہیں ان کے دل و دماغ اسے برحق نہیں تصور کرتے۔ اللہ کے ہاں اسی شہادت کا اعتبار ہے جس میں آدمی اس کے دین کو جان کر اور سمجھ کر ایمان لائے اور اس کے حق ہونے کی شہادت دے۔ نزولِ قرآن کے وقت نصاریٰ کے ایک طبقہ نے اسی طرح کی شہادت دی۔ یہ صحیح معنٰی میں شہادت تھی۔ قرآن نے اس کی تعریف وتوصیف کی۔ فرمایا:

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَى أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ○ (المائدہ:۸۳)

جب وہ اس کتاب کو سنتے ہیں جو رسول پر نازل کی گئی ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھیں آنسو سے ابل پڑتی ہیں، اس لیے کہ انھوں نے حق کو پہنچان لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے رب ہم اس پر ایمان لے آئے، ہمارا نام ان لوگوں میں لکھ دے جو اس کے حق ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔

یہ ایمانِ صادق کا حال ہے۔ اس کو حق جاننے اور اسے اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اسے چھپانا یا اس کی شہادت نہ دینا کتمانِ حق ہے۔ یہ اپنی ذات کو اور دنیا کو حق سے محروم رکھنے کی کوشش ہے۔ یہ انسانیت کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔ اہل کتاب اس ظلم کا ارتکاب کر رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ یہودیت اور نصرانیت ہی کو اصل دین ثابت

کیا جائے، اس کے لیے وہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے پورے خانوادے کا نام استعمال کرتے تھے اور انھیں اسی کا حامل قرار دیتے تھے۔ حالانکہ یہودیت ونصرانیت کا وجود ہی بہت بعد میں ہوا۔ ان کی کتابیں صاف بتا رہی تھیں کہ دین حنیف کیا ہے اور حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کی تعلیم کیا تھی؟ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ تعلیمات عام ہوں، وہ اپنی تاویلات کے ذریعہ انھیں چھپا رہے تھے، اسی کو ظلم کہا گیا۔ فرمایا:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ (البقرۃ:۱۴۰)

اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اس شہادت کو چھپاوے جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے آئی ہوئی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ان اعمال سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔

اہل کتاب کا یہ کتمان حق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ دنیا آپ کی رسالت کو نہ تسلیم کرے، وہ اس حقیقت کو فراموش کر چکے تھے کہ اللہ ان کے مکر وفریب سے باخبر ہے، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

'شہادت علی الناس' کا فرض بعض لازمی اوصاف اور خصوصیات کا تقاضا کرتا ہے۔ ان کی تکمیل کی بغیر صحیح معنٰی میں اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ یہاں دو چار خصوصیات کا ذکر کیا جا رہا ہے:

۱- 'شہادت علی الناس' کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے دین، اس کی اساسات، ان پر مبنی تعلیمات کا اچھی طرح علم ہو، ان کے دلائل اور حکمتوں سے گہری واقفیت ہو، آدمی اچھی طرح جانے کہ کس معاملہ میں اسلام کی تعلیم کیا ہے اور اس کی معنویت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں اس کا ذہن بالکل صاف ہو اور وہ کسی تذبذب میں مبتلا نہ ہوتا کہ پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ دنیا کے سامنے اسے پیش کر سکے۔

۲- 'شہادت علی الناس' کا تقاضا ہے کہ جس دور میں یہ کام انجام پائے اس دور کے افکار و خیالات اور رجحانات سے واقفیت ہو، آدمی اس کی خوبیوں اور خامیوں کو اچھی طرح جانے اور ان کے مقابلہ میں اسلام کی برتری ثابت کر سکے۔ دنیا کی عدالتوں میں بھی کسی معاملہ میں شہادت اس وقت کامیاب ہوتی ہے جب کہ آدمی اس کی تفصیلات

اوراس کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہو، ورنہ جرح میں بڑے سے بڑا گواہ بھی ناکام ہوجاتا ہے، اس لیے کہ اس نے معاملہ کو اس طرح دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی جس طرح کی کوشش ہونی چاہیے۔

۳- 'شہادت علی الناس' اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ دین کو اس کی اصل شکل میں پیش کیا جائے۔ حالات کے جبر اور دباؤ یا ذاتی وقومی مفادات کے تحت اس میں کوئی کمی بیشی نہ کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت تھی اور یہی ہدایت ہر اس شخص کے لیے ہے جو شہادت علی الناس کا فرض انجام دے رہا ہے:

يَـاَيُّهَـا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَ اِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ
(المائدہ:۶۷)

اے رسول! جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے (اسے لوگوں تک پورا پورا) پہنچادو۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو حقِ رسالت نہیں ادا کیا۔ اللہ تمھیں لوگوں کے ضرر سے محفوظ رکھے گا۔

۴- 'شہادت علی الناس' کے لیے ضروری ہے کہ دین کی بے خوف وخطر شہادت دی جائے۔ علی الاعلان حق کو حق اور باطل کو باطل کہنا بڑا جرأت آزما کام ہے۔ اس میں خطرات ہیں، آزمائش اور امتحان کا بھی امکان ہے۔ اس کے لیے دین حق سے بے پناہ محبت اور برملا اس کے اظہار کی جرأت چاہیے۔ اللہ کے رسولوں کی ایک خوبی یہ بھی بیان ہوئی ہے کہ وہ ہر خوف اور اندیشہ سے بالاتر ہوکر اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچاتے ہیں:

اَلَّـذِيْـنَ يُبَـلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَداً اِلَّا اللّٰهَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْباً ○ (الاحزاب: ۳۹)

وہ جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور محاسبہ کے لیے بس اللہ کافی ہے۔

دنیا کا کوئی بڑا کام خطرات سے خالی نہیں ہوتا۔ 'شہادت علی الناس' جیسا اعلیٰ وارفع مقصد خطرات سے پاک کیسے ہوسکتا ہے۔ اصحاب عزیمت کامیابی کے لیے ہر خطرہ مول لیتے ہیں اور اصحابِ عزیمت ہی یہ فرض بھی انجام دیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کی امت کو امت وسط اور خیر امت بنایا اور اس پر 'شہادت علی الناس' کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ موجودہ حالات کے پس منظر میں اس پر بعض سوالات کیے جاتے ہیں۔ ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ موجودہ دور میں امت کی یہ حیثیت عملاً ختم ہوگئی ہے۔ دنیا کی دوسری قومیں علم وفن، سائنس اور ٹکنالوجی، انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود کے کاموں میں اس سے بہت آگے ہیں۔ امت کے لئے ان کے پیچھے چلنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ ان حالات میں وہ ان کی قیادت ورہنمائی کیا کرے گی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ امت کو اس حالت سے نکلنا چاہیے۔ جو امت دنیا کی قیادت وراہ نمائی کے لئے وجود میں آئی ہے اور صدیوں راہ نمائی کرتی رہی ہے اس کا اس حال میں پہنچنا افسوس ناک ہے۔ بے عملی، غفلت اور کوتاہی کوئی عذر نہیں ہے۔ اس سے وہ ذمہ داری ساقط نہ ہوگی جو اللہ تعالیٰ نے اس پر عائد کی ہے۔ اس کے لئے اسے کل قیامت کے روز جواب دہ ہونا پڑے گا۔

دوسری بات یہ کہ 'شہادت علی الناس' کا فرض انجام دینے کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ امت دنیوی علوم وفنون اور مادی ترقی میں معاصر قوموں کی ہم پایہ یا ان سے برتر ہو۔ شہادتِ حق کا تعلق عقیدے اور فکر سے ہے۔ یہ ایک صاف ستھرا نظریۂ حیات ہے جو انسانی فطرت کو اپیل کرتا اور اس کو اندر سے بدلتا ہے۔ یہ سیرت وکردار ہی کو نہیں علوم وفنون اور مادی ترقی کو بھی صحیح رخ عطا کرتا ہے۔ اسے ایک بے سروسامان فرد بھی پیش کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول مادی لحاظ سے اونچی حیثیت کے مالک نہیں ہوتے تھے۔ جن قوموں سے انہوں نے خطاب کیا وہ اپنے وقت کی ترقی یافتہ قومیں تھیں، لیکن اللہ کے رسولوں کو سیرت وکردار کی بلندی حاصل تھی۔ انہوں نے دلائل کے ذریعہ اپنی قوموں کی گم راہی واضح کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسئلہ مادی طاقت یا سیاسی اقتدار کا نہیں، بلکہ دلیل و برہان کا ہے۔ امت موجودہ حالات میں اسی کی مکلّف ہے۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ امت مادی لحاظ ہی سے پیچھے نہیں ہے، بلکہ اس

کے اندر دینی اور اخلاقی زوال بھی پایا جاتا ہے۔ وہ دنیا کے سامنے سیرت و کردار کا کوئی بہتر نمونہ نہیں پیش کر رہی ہے۔ پھر دنیا اسے امت وسط کی حیثیت سے کیسے دیکھے گی اور وہ اس حیثیت میں کیسے اس کے سامنے آسکے گی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں 'امت وسط' کو صحیح معنی میں اسلام کا نمونہ ہونا چاہیے، لیکن عملاً ایسا نہیں ہے۔ 'شہادت علی الناس' کا فرض امت کے افراد اور جماعتوں کے ذریعہ بھی انجام پا سکتا ہے۔ یہود بہ حیثیت قوم مادیت میں سراسر گرفتار تھے۔ انہوں نے توریت اور اس کے احکام کو پس پشت ڈال رکھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد آپ کی عداوت میں غلط سے غلط قدم اٹھانے میں انہیں کبھی کوئی تامل نہیں رہا۔ لیکن اسی قوم میں ایک 'امت' ایسی تھی جو اپنی زندگی سے خدا ترسی کا ثبوت پیش کر رہی تھی اور 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا فرض انجام دے رہی تھی:

لَيْسُوْا سَوَاءً مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ○ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ (آل عمران:۱۱۳-۱۱۴)

وہ سب برابر نہیں ہیں۔ اہل کتاب میں ایک جماعت سیدھی راہ پر قائم ہے۔ اس کے لوگ رات کے اوقات میں اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ وہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہیں، بھلائی کے کاموں میں تیزی دکھاتے ہیں۔ یہی لوگ صالحین میں سے ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ○ (الاعراف:۱۵۹)

موسیٰ کی قوم میں ایک ایسی جماعت بھی ہے جو حق کی راہ دکھاتی ہے اور اسی کے مطابق فیصلہ کرتی ہے۔

احادیث سے ثابت ہے کہ اس امت میں بھی ہر دور میں ایک جماعت ایسی ضرور موجود ہوگی جو اسلام پر کاربند ہوگی، اس پر ہونے والے حملوں کا دفاع کرے گی،

دلائل سے اس کی حقانیت ثابت کرے گی اور احقاق حق اور ابطال باطل کا فرض انجام دیتی رہے گی۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لایزال ناس من امتی ظاهرین حتی یأتیهم امر الله وهم ظاهرون۔[۱]

میری امت میں ہمیشہ ایسے لوگ ہوں گے جو غالب ہوں گے۔ (یہ سلسلہ جاری رہے گا) یہاں تک کہ اللہ کا حکم (قرب قیامت) آجائے۔ اس وقت تک وہ اسی طرح غالب رہیں گے۔

حضرت معاویہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنا ہے:

لایزال من امتی امة قائمة بامر الله لایضرهم من خذلهم ولا من خالفهم حتی یأتیهم امر الله وهم علٰی ذلک .[۲]

میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم پر عمل کرنے والی رہے گی جو ان کو چھوڑ دے یا ان کی مخالفت کرے وہ اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔ یہاں تک کہ اللہ کا حکم (قرب قیامت) آجائے گا۔ اس وقت تک وہ اسی حال میں ہوں گے۔

اس مفہوم کی اور حدیثیں بعض دوسرے صحابہ سے بھی مروی ہیں [۳]

رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات کی امت کی تاریخ کے ہر دور میں تصدیق ہوتی رہی ہے۔ اس امت میں ہمیشہ ایسے افراد بھی رہے ہیں اور جماعتیں بھی پائی گئی ہیں جو دین حق پر ثابت قدم رہیں، اس کی صحیح تعبیر وتشریح پیش کی اور دنیا کے لئے اس کی ضرورت اور اہمیت واضح کرنے کی کوشش کی۔ سیاسی لحاظ سے چاہے انہیں اقتدار نہ حاصل رہا ہو، لیکن ان کی دینی اور اخلاقی برتری کا ثبوت ملتا رہا ہے۔ آج بھی امت اس سے خالی نہیں ہے۔ اس کا ایک طبقہ شہادت علی الناس کا فرض انجام دے رہا ہے۔ اللہ اس کی کوششوں کو کامیابی سے ہم کنار کرے۔

---

[۱] بخاری، کتاب المناقب مسلم ، کتاب الامارة ، باب قوله لاتزال طائفة من امتی الخ، مسلم کتاب الامارة ، باب لا تزال طائفة من أمتی الخ.

[۲] حوالہ سابق

[۳] مسلم، حوالہ سابق

عربی زبان میں خودنوشت سوانح نگاری کا ارتقاء

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

انسان اپنی جبلّت اور فطرت کی بنیاد پر ہر دور اور ہر زمانے میں زیادہ سے زیادہ علم ومعرفت کے حصول کے لیے سرگرداں رہا ہے۔ اس کی سعی وجہد کی جہات ہمیشہ سے مختلف اور متنوع رہی ہیں۔ وہ خارجی اور ذاتی ذرائع کو استعمال کرکے کائنات کے رازہائے سربستہ کی تلاش وجستجو میں منہمک رہا ہے۔ ظاہر ہے، انسان جو اس قدر اپنے گردوپیش سے دل چسپی رکھتا ہو، اپنی ذات سے کبھی غفلت نہیں برت سکتا تھا۔ اس کی ذات خود ایک جہان ہے اور یہاں صرف اس کی رسائی ہوسکتی ہے۔ وہ جہاں ایک طرف اپنی ذات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہیں دوسری طرف اپنے احساسات وتأثرات سے دوسروں کو بھی آگاہ کرتا ہے۔ اپنی ذات سے متعلق انسان کا یہ دوطرفہ عمل ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ چنانچہ جب ہم دورِ جاہلی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہاں بھی فہمِ ذات اور اظہارِ ذات کی مختلف پھوٹی ہوئی اور غیر منظّم کوششیں نظر آتی ہیں، جن کے عملی مظاہر آج بھی فخریہ، ہجویہ اور دوسری نوعیت کے قصائد کی شکل میں موجود ہیں۔ اسلام کی آمد کے بعد جب علوم وفنون کو باضابطہ ترقی ملی اور لکھنے پڑھنے کا رواج عام ہوا تو دوسری اصنافِ سخن کی طرح سیرت نگاری کو بھی پھلنے پھولنے کا بھرپور موقعہ میسر آ گیا۔

قبل اس کے کہ قدیم عربی ادب میں سیرت نگاری کی تاریخ اور اس کے ارتقائی مراحل کا جائزہ لیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قدماء کی اس صنف سے آگہی اور واقفیت کی تفصیلات کا پتا لگایا جائے۔ اس سے اس فن کے تعلق سے ان کے موقف کے فہم ومعرفت میں مدد ملے گی اور زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ معلوم کیا جاسکے گا کہ ادب کی اس اہم ترین صنف کے بارے میں ان کا رویہ کیا رہا ہے؟

خودنوشت سوانح عمری کے لیے مستعمل اصطلاحات

قدیم عربی ادب کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خودنوشت سوانح عمری کے لیے دو الفاظ استعمال ہوتے تھے: ایک 'سیرۃ' اور دوسرا 'ترجمہ'۔ عربوں کے یہاں فرد کی تاریخ نے مختلف شکلیں اختیار کی۔ ان میں اولین شکل 'سیرۃ' کی تھی۔ سیرۃ کا یہ لفظ 'سار، یسیر، سیراً' سے نکلا ہے جس کے مختلف معانی ہیں (۱) جانا، روانہ ہونا، چلنا (۲) طریقہ و مذہب (۳) سنت (۴) ہیئت (۵) حالات (۶) کردار (۷) کہانی (۸) آں حضرت ﷺ کے مغازی کا بیان (۹) آپؐ کے پورے احوال زندگی کا بیان۔[۱]

اس لفظ کے اصطلاحی مفہوم کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ لفظی معنٰی 'طریقہ' سے نکل کر شرع میں اس پر خاص معنٰی 'طریقۃ المسلمین فی المعاملۃ مع الکافرین' (کافروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں مسلمانوں کا طریقہ) غالب آ گیا۔ شروع میں یہ آں حضور ﷺ کی جنگوں میں طریقۂ کار کے لیے بولا جاتا تھا، بعد میں تمام امور میں آپؐ کے طریقۂ کار کے لیے بولا جانے لگا، بلکہ اس سے بھی وسیع ہوکر اس کا استعمال دوسرے لوگوں کے طریقۂ کار کے لیے بھی ہونے لگا۔[۲]

عربوں میں سیرت نگاری کی مختلف شکلیں رہی ہیں۔ بعض کتابیں مخصوص طور سے کسی ہستی کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کرتی ہیں اور بعض کتابوں میں بہت سے لوگوں کے تذکرے ہوتے ہیں۔ ان سب کے لیے الگ الگ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ سرِ دست لفظ 'سیرۃ' یہاں زیرِ بحث ہے۔ اس کا اطلاق شروع میں صرف رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ اور غزوات پر ہوتا تھا، لیکن بعد میں عام ہوکر دوسرے لوگوں کی زندگیوں کے لیے بھی اس کا استعمال ہونے لگا۔ مثلاً عوانہ کلبی (م ۱۴۷ھ) نے حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ اور ان کے خاندان کی تاریخ 'سیرۃ معاویۃ وبنی امیۃ' کے نام سے تحریر کی۔[۳] اس کا تذکرہ ابن ندیم نے کیا ہے۔ اس کا زمانۂ ظہور سیرۃ ابن اسحاق (م ۱۵۱ھ) سے قریب لگتا ہے۔ بعد کے زمانوں میں یہ زیادہ عام معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ خودسیرت نگاری کا فن جب آگے بڑھا تو اس کی بہت سی شاخیں 'طبقات'، 'تراجم' اور جرح و

تعدیل، وغیرہ کے ناموں سے وجود میں آ گئیں۔

جہاں تک لفظ 'ترجمہ' کا معاملہ ہے تو اس کا استعمال ساتویں صدی کے اوائل تک نہیں ملتا۔ ساتویں صدی ہجری میں سب سے پہلے یاقوت حموی نے اپنی معجم میں اس لفظ کا استعمال کسی شخص کی سوانح کے معنیٰ میں کیا۔ اس خیال کو تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ ابوالفرج الاصفہانی نے اپنی کتاب الأغانی میں اس لفظ کا استعمال نہیں کیا، حالاں کہ انھوں نے بہت سے شعراء اور ادباء کی زندگیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ اس کی جگہ خبر اور اخبار کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لفظ ترجمہ کا استعمال اصطلاحی طور سے مختصر سوانح حیات کے لیے اور لفظ سیرت کا استعمال طویل سوانح حیات کے لیے ہونے لگا۔ یہ تفریق بھی ماضی میں تھی۔ اب جدید اصطلاح میں ان دونوں کو ہم معنیٰ تصور کیا جاتا ہے اور پھر یہیں سے 'السیرۃ الذاتیۃ' یا 'الترجمۃ الذاتیۃ' کا استعمال لفظ 'خودنوشت' (Autobiography) کے معنی میں ہونے لگا۔[۴]

عربی میں خودنوشت سوانح عمریوں کا آغاز

سیرت نگاری کا فن عربوں میں اپنی ابتدائی شکل سے لے کر آج تک مختلف شکلیں اختیار کر چکا ہے۔ اس کی تقسیم اور تہذیب نیز اسے بہتر، مفید اور ثمر آور بنانے کے لیے اس کے اصول وضوابط اور اوصاف وخصائص کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ سطور ذیل میں اس کی ایک مخصوص اور نازک صنف 'خودنوشت' سے متعلق بعض باتیں پیش کی جارہی ہیں۔

سیرت نگاری کے ساتھ ساتھ اس سے متعلق جو دوسرے فنون عربوں میں متعارف ہوئے ان میں خودنوشت سوانح نگاری بھی ہے۔ غالباً اس کی طرف توجہ فارسی اور یونانی آداب سے واقفیت کے بعد ہوئی۔ ایرانیوں کے بارے میں عربوں کو یہ معلوم ہوا کہ ان کے بادشاہ اور دوسرے قومی رہ نما اپنی ذاتی زندگی اور وصیتیں اپنے لڑکوں کے لیے قلم بند کردیا کرتے تھے، پھر دوسری قوموں کے ساتھ اختلاط کے بعد انھیں انفرادی اور

اجتماعی طور پر اپنی شخصیت کے تحفظ کا احساس پیدا ہوا۔ مزید یہ کہ جزیرۂ عرب سے باہر نکلنے کے بعد زندگی کے مختلف میدانوں میں عربوں نے جو وسیع و عریض متمدن دنیا دیکھی اور اس پر فتح حاصل کی تو انھیں اپنے تجربات و مشاہدات سے دوسرے لوگوں کو روشناس کرانے کی فکر دامن گیر ہوئی۔[۱۵] اس کے علاوہ بعض دوسرے اسباب بھی ہیں جن کی وجہ سے قدماء نے اپنے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ انھوں نے باضابطہ خودنوشت کا لفظ تو نہیں استعمال کیا، لیکن جو کچھ لکھا وہ اس اصطلاح کے مطابق تھا۔ یہ سوانح عمریاں اپنے مصنفین کی زندگیوں کی کس حد تک تصویر کشی کرتی ہیں اور ان میں نمائندہ کتابیں کون سی ہیں؟ پھر ان میں کیا کمیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں؟ ان کا جائزہ آئندہ سطور میں لیا جائے گا۔

قدیم خودنوشت سوانح نگاری کے محرکات

قدیم عربی خودنوشت سوانح عمریوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف مقاصد اور محرکات کے تحت لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی پشت پر ایک مقصد ہوتا ہے جو مصنف سے لکھنے کا بار بار مطالبہ کرتا ہے، جب یہ اصرار کی حد تک بڑھ جاتا ہے تو مصنف کے لیے اپنی قومی زندگی کے احوال اور نجی تجربات کا بیان ضروری ہو جاتا ہے۔ بعض مصنفین اپنی تالیفِ خودنوشت کے محرکات کا تذکرہ کر دیتے ہیں اور بعض تذکرہ تو نہیں کرتے، لیکن ان کی خودنوشت کے مطالعہ سے ان کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ خواہ مصنف تذکرہ کرے یا نہ کرے، کچھ داخلی محرکات تو ضرور کارفرما ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک سے زائد محرکات کارفرما ہوتے ہیں۔ قدیم عربی خودنوشت سوانح میں کچھ مشترک اوصاف پائے جاتے ہیں۔ خوبیوں میں یہ اشتراک عوامل اور محرکات میں اشتراک کے باعث پیدا ہوا۔ اگر عوامل و محرکات کے لحاظ سے ان خودنوشت سوانح عمریوں کی تقسیم کی جائے تو یہ کچھ اس طرح ہوگی۔

۱- مدافعانہ اور معذرت خواہانہ: اس میں مصنف اپنے کسی خاص فکر اور موقف

کی وضاحت کرتا ہے اور اگر عوام وخواص میں اس کے کسی نظریہ یا عمل کے بارے میں کوئی غلط فہمی پائی جاتی ہو تو اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ قدیم عربی سرمایے میں حنین بن اسحاق، سموال بن یحییٰ المغربی اور 'طبیب مصری' کی خودنوشتیں اسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہیں۔ مفصل اور طویل تالیفات میں المؤید فی الدین کی 'سیرۃ المؤید فی الدین داعی الدعاۃ'[۶] امیر عبداللہ بن یلقین کی ''التبیان عن الحادثۃ الکائنۃ بدولۃ بن زیری فی غرناطۃ'[۷] اور علامہ ابن خلدون کی 'التعریف بابن خلدون ورحلتہ شرقا وغرباً'[۸] اسی قسم کی خودنوشتوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

۲- روحانی کش مکش کی تصویر گری کرنے والی: اس قسم میں وہ خودنوشت سوانح عمریاں شامل ہیں جن کے مؤلفین روحانی اعتبار سے اضطراب وانتشار کے شکار رہے ہیں، ان میں سے بعض کو کوئی متعین راہ مل گئی اور بعض آخری وقت تک یوں ہی سرگرداں رہے۔ ایسی تالیفات میں امام غزالی کی 'المنقذ من الضلال'[۹] امام رازی کی 'السیرۃ الفلسفیۃ'، حارث محاسبی کی 'کتاب النصائح' کے بعض حصے اور ابن ہیثم کی اپنی خودنوشت بطور مثال پیش کی جاسکتی ہیں۔[۱۰]

۳- معاشرے کی رسوم اور رواج کے خلاف اپنے تاثرات کا اظہار: اس مقصد کے لیے لکھی جانے والی تالیفات میں ابوالعلاء المعری کے بعض رسالے اور ابوحیان التوحیدی کی 'فی مثالب الوزیرین'، 'فی الصداقۃ والصدیق' اور 'الإمتاع والمؤانسۃ' ہیں۔ لیکن اس مقصد کے لیے کسی مستقل بالذات تصنیف کا پتا نہیں چلتا۔ کسی دوسرے مقصد کے تحت لکھی گئی تالیفات میں یہ مقصد بھی موجود پایا گیا ہے۔

۴- اپنی مثالی زندگی کی تصویر کشی: اس میں انشا پرداز اپنی اخلاقی، عقلی اور فکری زندگی کی تفصیلات سے آگاہ کرتا ہے، تاکہ لوگ ان سے مستفید ہوں۔ اس کی مثال عبدالرحمٰن بن جوزی کی 'لفتۃ الکبد فی نصیحۃ الولد'، عبدالوہاب شعرانی کی لطائف المنن اور حلاّج، ابن عربی اور سہروردی کی اپنی ذات سے متعلق تحریریں ہیں۔ خالص فکری زندگی کے تمام مراحل کی تفصیلات سے آگاہ کرنے کے لیے لکھی جانے والی

تالیفات میں البیرونی، رازی، ابن الہیثم، سخاوی، سیوطی اور ابن طولون کی تحریریں ہیں۔ مؤخر الذکر کی تالیف کا نام 'الفلک المشحون فی أحوال محمد بن طولون' ہے۔[۱۱]

۵- زندگی کے تجربات اور اہم یادگار واقعات کو محفوظ رکھنے کی خواہش: اس میں وہ تالیفات شامل ہیں جن کی تحریر کا مقصد اپنی مفید اور مؤثر زندگی کے تجربات و مشاہدات کی تصویر کشی ہو۔ عربی ادب میں اُسامہ بن منقذ کی 'کتاب الاعتبار'[۱۲]، ابن حزم کی 'طوق الحمامة فی الألفة والالّاف'[۱۳] اور عمارہ یمنی کی 'النکت العصریة' اس قسم کی بہترین مثالیں ہیں۔

مذکورہ بالا مباحث سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ عربی ادب میں اظہارِ ذات کی اعلیٰ و ارفع شکل 'خودنوشت' کا وجود بہت عرصہ پہلے سے رہا ہے اور یہ کہ اس کی تالیف کے محرکات بھی وہی رہے ہیں جو دوسری زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔

خودنوشت سوانح عمریوں کے خصائص و امتیازات

قدیم عربی خودنوشت کے تعلق سے ایک اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جسے ہم آج یومیات، مذکّرات اور اعترافات کے نام سے جانتے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس زمانے میں یہ اصطلاحات عام نہیں تھیں، البتہ ان کے مشمولات عربی زبان کی بہت سی تالیفات میں موجود ہیں، چنانچہ اگر ہم اس نقطۂ نظر سے عربی سرمایے کا جائزہ لیں تو قاضی فاضل کی کتاب 'فی منامات' کا طرز، اسلوب اور مواد آج کے زمانے میں معروف اصطلاح 'یومیات' سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے۔ اسی طرح بہت سے سیاحوں نے بھی اپنے سفرنامے روز بروز تحریر کرنے کا معمول بنا رکھا تھا۔ ان کا یہ طرز بھی یومیات سے ملتا جلتا ہے۔ مذکرات کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے۔ ایسی تحریریں تو بہ کثرت موجود ہیں جن میں شخصیات، احوال و واقعات اور تجربات و مشاہدات کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مذکّرات سیرت کی ان کتابوں کے ساتھ مل کر بھی آئے ہیں جن میں وزراء اور حکام

کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔ مصنف انھیں اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں قلم بند کرتا ہے، گویا ان میں مصنف کی ذات اور دوسروں کی سیرت دونوں کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ اس طرح کی کتابوں میں، نسوی کی 'سلطان جلال الدین' اور ابن شداد کی 'سلطان صلاح الدین' کا نام بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں 'اعترافات' کا سلسلہ زیادہ عام اور مقبول ہوا ہے۔ ان کا تعلق زیادہ تر روحانی اور فکری مسائل سے ہوتا ہے۔ خاص طور سے اپنے گناہوں، جسمانی لذت اندوزیوں اور دیگر لغزشوں کا بیان کر کے کبھی اظہارِ ندامت کیا جاتا ہے اور کبھی اظہار فخر۔ اسی طرح کبھی کبھی سرگرداں اور پریشان حال دکھا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں محاسنی کی 'النصائح الدينية' اور امام غزالی کی 'المنقذ من الضلال' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ابن ہیثم اور رازی کی تحریروں میں بھی اس طرح کے اعترافات بہ کثرت موجود ہیں۔[۱۴]

دور حاضر کی خودنوشتوں میں پرجوش انقلابیت، معاشرے سے علی الاعلان بغاوت اور روایات واقدار کا کھلے عام استہزا اور تمسخر کا جو انداز پایا جاتا ہے، قدیم عربی ادب کی خودنوشتوں میں یہ چیز زیادہ ابھری ہوئی نہیں ملتی۔ وہاں بالعموم حوالگی اور خودسپردگی کا رنگ غالب ہے، حتی کہ بعض وہ شخصیات جن کی صلابت اور مصائب برداشت کرنے میں بے پناہ مشق وممارست ضرب المثل تھی وہ بھی مشکلات کے سامنے سپر ڈال دیتی ہیں اور گوشہ نشینی وجلاوطنی کو ترجیح دیتی ہیں۔ گویا ان کے پیچھے ان کا یہ نظریہ کام کرتا ہے کہ ان کے بارے میں سوچنا، غور وفکر کرنا اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے سعی وکوشش کرنا ان کا اپنا کام نہیں ہے، بلکہ یہ قضاوقدر کے فیصلے کے تحت انجام پاتے ہیں۔ ان لوگوں میں علامہ ابن خلدون جیسے فرد بھی شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کش مکش کا وہ احساس جو فن کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے، قدیم عربی خودنوشت سوانح عمریوں میں بہت کم زور ہے، البتہ نفس سے کش مکش اور تصادم تو ہر آن اور ہر لمحہ موجود ملتا ہے۔[۱۵]

اس کے بالمقابل اعتراف، صراحت اور نفس کی کم زوریوں کی وضاحت کا عنصر عربی خودنوشتوں میں قدرے نمایاں ہے، خاص طور سے ان لوگوں کی تحریروں میں جو کسی

مخصوص فکری اور روحانی زاویۂ نظر کے مالک ہوں۔ مثلاً ابن ہیثم اس حقیقت کا صاف اعتراف کرتے ہیں کہ دینی امور میں اپنے تمام تر انہماک اور توجہ کے باوجود انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا، چنانچہ انھوں نے عقلی امور میں انہماک اور توجہ کو اپنا مقصود بنالیا۔ اسی طرح امام غزالی نے اس کا اعتراف کیا کہ انہیں بدیہی امور کے علاوہ ہر معاملے میں شک وشبہ ہوگیا تھا، لیکن انھوں نے بعد میں اپنی اس انقلابیت کو تصوف کی آغوش میں آکر ہمیشہ کے لیے دفن کردیا۔ ۱۶؎ البتہ جہاں تک ذاتی زندگی میں بعض مخصوص حالات کے تحت بعض حقائق کے اعتراف کا معاملہ ہے تو عربی خودنوشتوں یا مذکّرات یا یومیات میں اس کا وجود بہت کم ملتا ہے۔ ہاں ابن حزم کو اس میدان میں ضرور یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب 'طوق الحمامۃ' میں عشق ومحبت کے بعض واقعات کا اعتراف کیا ہے اور ان کے تعلق سے اپنے دل کی گہرائیوں سے بعض حقائق پیش کیے ہیں۔ ۱۷؎

جس طرح قدیم عربی خودنوشت سوانح عمریوں میں ہمیں انقلابیت اور اپنی کم زوریوں کے اظہار کی کمی نظر آتی ہے اسی طرح نفسیاتی عمق کی بھی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ وصف مذکورہ بالا دونوں اوصاف کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور اس کا وجود بڑی حد تک فرد اور معاشرے کے درمیان اور فرد کے بارے میں اور اپنے معاشرے کے بارے میں خیالات کے درمیان ہم آہنگی اور توافق کی موجودگی پر منحصر ہے۔ یہ اس انفرادی فخر کے بالمقابل بھی بہت گہری چیز ہے جو اپنی اچھائیوں اور دوسروں کی برائیوں کے تذکرہ پر قائم رہتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں آج بھی سطحیت پائی جاتی ہے، کیونکہ شخصیت کی فلسفیانہ توجیہ یہاں کم زور یا ناپید ہے۔ یہاں ناولوں، افسانوں، ڈراموں اور سوانح عمریوں میں خارجی حرکات وسکنات اور عوامل کے نقل کرنے میں تو مہارت کا اظہار کیا جاتا ہے، لیکن اندرونِ نفس غوّاصی اور غوطہ خوری کی کوشش بہت کم ہوتی ہے، حالانکہ یہی وہ عمق ہے جس کی وجہ سے شخصیات کو بقاودوام کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ ۱۸؎

مذکورہ بالا مباحث میں قدیم عربی خودنوشت سوانح عمریوں کے اندر جو اہم کم زوریاں بتائی گئی ہیں ان کی موجودگی کے بعض اسباب (مثلاً طبعی نسیان، قصداً

نظر انداز کرنا، فطری حیاوشرم وغیرہ) تو وہ ہیں جو ہر زبان کی خودنوشت سوانح عمریوں کے لیے مسئلہ بنے ہیں، لیکن بعض اسباب عربوں سے خاص طور پر متعلق ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ عرب فطرۃً دیگر قوموں کے بالمقابل زیادہ باحیا اور خوددار واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنے یا اپنے بھائیوں کے مصائب طشت از بام کرنے سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ عرب جس دین کے علم بردار ہیں اس کی تعلیمات اولاً اخلاقی مفاسد پر ہر طرح سے قدغن لگاتی ہیں۔ ثانیاً ان کے تذکرہ اور تشہیر کو بھی سختی سے ممنوع قرار دیتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ عربوں کی معاشرت میں اخلاقی مفاسد کو بہر حال ہمیشہ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ان خودنوشتوں میں بہت زیادہ وضاحت اور صاف گوئی کی راہ میں حائل ایک رکاوٹ عربوں کی سیاسی صورت حال بھی ہے۔ یہ صورت حال ہمیشہ پیچیدہ اور آزادئ فکر ورائے پر پابندی کی قائل رہی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بدوی نے ایک سبب کی طرف مزید رہ نمائی کی ہے، لکھتے ہیں:

> ''آریوں کے بالمقابل سامیوں کے یہاں چونکہ شخصیت کا تصور بڑا پر پیچ رہا ہے، اس لیے عربوں میں خودنوشت سوانح نگاری کا فن اس قدر ترقی پزیر نہیں ہوسکا جتنا آریائی نسل کے لوگوں میں ہوا۔ انھوں نے اس ادبی صنف کو اپنی فکری اور تحریری سرگرمیوں کی جولان گاہ بنایا، یہاں تک کہ اسے ادب کا ایک اعلیٰ فن بنادیا، کیونکہ ان کے اندر اپنی شخصیت کا احساس بہت قوی اور واضح ہے۔ عربوں میں سے جنھوں نے اس باب میں کچھ لکھا ہے ان میں سے بیش تر خالص عرب نہیں تھے، بلکہ دوسری جنسوں سے مرکب تھے''۔[۱۹]

قدیم عربی خودنوشت سوانح عمریوں میں صراحت اور وضاحت کی کمی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ وصف وہاں سرے سے موجود ہی نہیں ہے، کیونکہ جو شخص ابن الہیثم، رازی اور ابن خلدون وغیرہ کی تحریروں کا مطالعہ کرے گا وہ ان میں اس وصف کی موجودگی کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ ابن الہیثم نے صاف طور سے لوگوں کے معتقدات

کے خلاف آواز اٹھائی۔ اسی طرح محمد بن زکریا رازی نے اپنی کتاب 'السیرۃ الفلسفیۃ' میں رائج الوقت فلسفیانہ افکار اور معاشرتی رسوم کے خلاف اپنا ذاتی موقف پیش کیا، جس کے باعث وہ مطعون ہوئے، لیکن اپنے موقف سے رجوع نہیں کیا۔ اسی طرح علامہ ابن خلدون نے بھی مختلف سیاسی و سماجی مسائل کے ضمن میں عام لوگوں سے ہٹ کر اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اگر مضمون اور مواد سے ہٹ کر خالص فنی لحاظ سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عہد ماضی کی بیش تر عربی خودنوشت سوانح عمریوں میں فن کی وہ تمام خوبیاں اور عناصر پائے جاتے ہیں جو انھیں عہد جدید کی خودنوشت سوانح عمریوں سے قریب کر دیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا اسلوب صاف اور واضح ،عبارتیں شیریں، پیش کش خوب صورت اور سلیس اور اندازِ بیان افسانوی ہوتا ہے۔ ان سے ماضی کی تمام یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور واقعات و تجربات کی تصویر کشی سے جذبات میں حرکت اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔

ان خودنوشت سوانح عمریوں میں سے بیش تر نے زمانی و مکانی عناصر کے اثبات، شخصیات اور مقامات کے ناموں کی وضاحت اور تاریخ کی روشنی میں واقعات کی تفصیل وغیرہ پر توجہ دی ہے۔ اسی کے ساتھ اِن میں زبان اور اسلوب وغیرہ پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ اس طرح یہ آپ بیتیاں کسی حد تک قاری کی توقعات پر پوری اترتی تھیں۔ چنانچہ انھیں عوام و خواص کے درمیان یکساں مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان میں سے بعض کے افسانوی طرز بیان نے ان سے دل چسپی اور شغف میں مزید اضافہ کر دیا۔

قدیم خودنوشت سوانح عمریوں کے فنّی محاسن اور بعض کمزوریوں کا جو کچھ تذکرہ سطور بالا میں کیا گیا ہے وہ فی الواقع ان کی مجموعی تصویر ہے، ورنہ اگر انفرادی طور سے ہر خود نوشت سوانح عمری کو الگ الگ جانچا پرکھا جائے تو اس پہلو سے بھی بعض کمیاں مل سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بیش تر جدید تعریف کی رو سے خود نوشت کی فہرست سے خارج ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ بعض خودنوشت سوانح نگاروں نے اس سمت بہترین کوششیں کی ہیں اور اپنے احوال کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی اور دوسری ضروری شرطیں

پوری کرنے میں کامیابی بھی حاصل کی، جن میں ابن الہیثم، امیر عبداللہ، محمد بن زکریا رازی، اسامہ بن منقذ، ابن خلدون اور شعرانی کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، لیکن ان مشاہیر ادب و تاریخ کی خود نوشت سوانح عمریوں میں کسی نہ کسی پہلو سے کچھ کمیاں ایسی باقی رہ گئیں جن کے باعث وہ عربی سرمایے کی اچھی اور نمائندہ کوشش ہونے کے باوجود جدید تعریف کے مطابق مکمل نہیں قرار پاتی ہیں۔ ان میں سے دو خودنوشت سوانح عمریاں جدید تعریف پر بڑی حد تک پوری اترتی ہیں: ایک الاعتبار لأ سامہ بن منقذ اور دوسری مذکرات الأ میر عبداللہ۔ اول الذکر زبان و بیان کے اعتبار سے فن کا جیتا جاگتا نمونہ ہے ۔ زبان سلیس اور انداز افسانوی ہے۔ اس سے مؤلف کی طویل زندگی کے تجربات اور شخصیت کے پیچ و خم ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اسی طرح امیر عبداللہ کی خودنوشت ان کی شخصیت کے تمام مراحل کی عکاسی کرتی ہے۔ امیر عبداللہ ایک بہترین اسلوب کے مالک تھے۔ ان کی زندگی آسائشوں اور کلفتوں سے عبارت تھی۔ اس لیے متوقع طور پر یہ ایک دل چسپ اور لائق مطالعہ خودنوشت بن گئی ہے۔ اس میں حقائق سے زیادہ تعرض کیا گیا اور تصور و خیال سے کم سے کم مدد لی گئی ہے۔

قدیم خودنوشت سوانح عمریوں کا اجمالی تعارف

قدیم عربی خودنوشت سوانح عمریوں کے سرمایے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیئت اور شکل وصورت کے اعتبار سے ان کے درمیان تنوّع اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض خود نوشتیں اگر مکمل ہیں تو بہت سی غیر مکمل۔ اسی طرح بعض کی حیثیت مستقل بالذات خودنوشت کی ہے تو بعض کی حیثیت ضمنی اور ذیلی ہے۔ ٹھیک اسی طرح چونکہ یہ خودنوشت سوانح عمریاں مختلف طبقات اور مختلف میدان کے لوگوں کے ذریعہ لکھی گئی ہیں اس لیے ان کے مضمون اور دوسری تفصیلات میں بھی فرق ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض قدیم خودنوشت سوانح عمریوں کا تعارف پیش کیا جائے۔[۲۰]

۱- **رسالة عن سيرة حنين بن إسحاق**

حنین بن اسحاق (م ۲۶۰ھ) نے یہ رسالہ یونانی طبیب اور فلسفی جالینوس سے

متأثر ہوکر لکھا ہے۔اس میں اس نے اپنی زندگی کے واقعات بیان کیے ہیں اوران مشکلات کا ذکر کیا ہے جو اس کے حاسدین کی سازشوں سے خلیفہ متوکل کے دربار میں پیش آئی تھیں۔ یہ رسالہ ابن ابی اصیبعہ کی کتاب 'عیون الانباء فی طبقات الأطباء' میں مذکور ہے۔

۲- السیرة الفلسفیة (محمد بن زکریا رازی)

یہ رسالہ بھی جالینوس سے متأثر ہوکر لکھا گیا ہے۔اس میں رازی نے اپنی فلسفیانہ زندگی کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ابن ابی اصیبعہ کی کتاب میں اس کا کچھ حصہ موجود ہے۔

۳- النکت العصریة (عمارۃ الیمنی)

یہ کتاب فی الواقع مصری وزراء کے بارے میں ہے،لیکن اس میں مصنف نے اپنی زندگی کی داستان بھی قلم بند کی ہے اور اپنی بہت سی حکایات اور قصائد کا ذکر کیا ہے۔

۴- منادمات (قاضی فاضل)

قاضی فاضل نے اس میں اپنی زندگی کی بہت سی باتیں نقل کی ہیں۔اس کتاب کو عربی زبان میں اعترافات کی نوعیت کی کتاب سمجھا جاتا ہے۔

۵- الفلک المشحون فی أحوال محمد بن طولون

دسویں صدی ہجری کے معروف مؤرخ محمد بن علی بن طولون نے یہ رسالہ مستقل طور سے اپنے حالات کے بیان میں لکھا ہے۔

۶- لفتة الکبد الی نصیحة الولد (عبدالرحمٰن بن الجوزی)

یہ رسالہ اصلاً ابن جوزی نے اپنے بیٹے کی نصیحت کے لیے لکھا ہے،لیکن چونکہ اس میں اپنی تالیفات اور حکایات کو بھی نقل کیا ہے اس لیے اسے خودنوشت کی قبیل کا سمجھا جاتا ہے۔

۷- الضوء اللامع لأهل القرن التاسع (شمس الدین سخاوی)

یہ کتاب نویں صدی کے لوگوں کی تاریخ پر مشتمل ہے۔اس میں مصنف نے اپنی زندگی کے احوال بھی بیان کیے ہیں۔

۸- **الإحاطة فی أخبار غرناطة** (لسان الدین بن خطیب)

اس کتاب میں مصنف نے غرناطہ کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ اپنے احوال زندگی بھی شامل کردیے ہیں۔

۹- **حسن المحاضرة فی أخبار مصر والقاهرة** (جلال الدین السیوطی)

اس کتاب کا معاملہ بھی مذکورہ بالا دونوں کتابوں کی طرح ہے کہ اس میں مصنف نے اپنے احوال زندگی بھی بیان کردیے ہیں۔

۱۰- **سیرة ابن الهیثم**

اس کتاب کے بعض اقتباسات ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں۔ابن ہیثم کی جرأت، بے باکی اور صاف گوئی قابل ستائش سمجھی جاتی ہے کہ اس نے مختلف عقائد اور دیگر مسلّم امور وروایات کے خلاف آواز بلند کی اور شک کا اظہار کیا۔[۲۱]

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ بعض دوسری تحریریں بھی ملتی ہیں جن میں مصنفین نے اپنی زندگیوں کے احوال خود بیان کیے ہیں، مثلاً ابن ابی اصیبعہ ہی نے ابن سینا، موفق الدین البغدادی اور ابن رضوان کی مختصر خودنوشتیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں۔[۲۲] اسی طرح جاحظ، ابوحیان توحیدی اور صلاح الصفدی وغیرہ کی بھی ایسی تحریریں موجود ہیں جن میں ان کے احوالِ زندگی اور حکایات و واقعات مذکور ہیں۔ان کے علاوہ بھی عربی زبان میں بعض دوسری تالیفات کا وجود ملتا ہے جو کسی نہ کسی پہلو سے اپنے مصنفین کا تعارف پیش کرتی ہیں۔

عربی کی چند خودنوشت سوانح عمریوں کا مفصل تعارف

عربی زبان کی مختصر یا طویل، اسی طرح مستقل یا غیر مستقل خودنوشت سوانح حیات کے مذکورہ اجمالی تعارف کے بعد اب بعض ایسی تصنیفات کا تعارف مقصود ہے جو قدرے طویل ہیں اور جن کی حیثیت بھی مستقل بالذات جیسی ہے۔ان میں ان کے مؤلفین نے اپنے احوالِ زندگی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ایسی چھ قدیم کتابوں کا سطورِ ذیل میں

تذکرہ کیا جارہا ہے:

۱-طوق الحمامة فی الألفة والأُلّاف

یہ کتاب ابن حزم اندلسیؒ (۳۸۴-۴۵۶ھ) کی تالیف ہے۔ امام ابن حزم مختلف دوسری خوبیوں اور اوصاف کے علاوہ فقہ کے ایک مستقل مسلک کے بانی ہیں۔ دینی امور میں ان کا تشدّد اور جارحانہ انداز معلوم ومعروف ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی یہ کتاب اپنے جذباتِ محبت کی تعبیر وتفصیل کے لیے تحریر کی ہے۔ عربی زبان کے ذخیرۂ کتب میں اس کتاب کو اس حیثیت سے نمایاں مقام ہے کہ اس میں مصنف کے کم زور گوشۂ زندگی بھی دائرۂ تحریر میں آ گئے ہیں۔ یوں موجودہ اصطلاح کے مطابق یہ 'اعترافات' کی نوعیت کی کتاب ہے۔[۲۳] مصنف کی صاف گوئی اور صراحت کا عالم یہ ہے کہ مذہبی حیثیت کے حامل ہونے کے باوجود اپنے تجرباتِ عشق ومحبت کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ اس کتاب میں ہزاروں چھوٹی چھوٹی حکایاتِ محبت مذکور ہیں۔ اس کا انداز افسانوی ہے۔ اس میں کل تیس فصلیں ہیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے پانچویں صدی ہجری کے اندلس کی اندرونِ خانہ صورت حال ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ صورت حال بے حد ابتر تھی۔ فارغ البالی اور خوش حالی کی وجہ سے لذت اندوزی اور نفس پرستی کا ہر طریقہ وہاں عام تھا۔ ظاہر ہے، اسی سماج سے ابن حزم کو بھی واسطہ پڑا تھا۔ انھوں نے بھی مختلف ادوار اور مراحل سے گزر کر علمی و دینی لحاظ سے شہرت حاصل کی تھی۔ انھوں نے کوئی بات مخفی نہیں رکھی اور اپنے احوالِ دل اور کیفیاتِ قلبی بڑی دقت اور مہارت سے لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔[۲۴]

اس کتاب کے ابواب اور اس کے مشمولات دیکھ کر ہی اس کے مصنف کی باریک بینی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کے تیس ابواب میں سے دس میں محبت کے اصول بتائے گئے ہیں۔ بارہ ابواب میں محبت کے اغراض ومقاصد اور اس کی پسندیدہ و ناپسندیدہ صفات بتائی گئی ہیں۔ پھر چھ ابواب میں محبت کے ساتھ پیش آنے والی مشکلات

کا تذکرہ کیا گیا ہے اور آخری دو ابواب میں پاکیزگی کے فائدے اور معصیت کے نقصانات بتائے گئے ہیں۔ پوری کتاب میں بڑی حد تک محبت کی تمام شکلوں اور جزئیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب مصنف کی اور اس عہد کے پورے معاشرے کی زندہ تصویر پیش کر دیتی ہے۔ کتاب کی ادبی، فنی اور دوسری خوبیوں کی بنیاد پر اسے عربی زبان کی ایک بہترین خودنوشت قرار دیا گیا ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ نفسیاتی تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ ۲۵

اس کتاب میں مذکورہ خوبیوں کے ساتھ بعض خامیاں بھی ہیں۔ مثلاً کتاب میں بعض واقعات کی نسبت مصنف نے صراحت سے اپنی طرف نہیں کی ہے۔ بس اشاروں کنایوں سے کام لیا ہے۔ زندہ لوگوں کے واقعات خاص طور سے بغیر نام کی صراحت کے بیان کیے ہیں۔ بہت سی یادیں بھی نسیان کی شکار ہوگئیں۔ ساتھ ہی کتاب میں اشعار کی کثرت ہے۔ کہیں کہیں صنائع و بدائع کی بھی زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ کہیں کہیں 'عریاں ادب' (الادب المکشوف) کا مظاہرہ بھی ہوا ہے۔ ۲۶

۲- السیرۃ المؤیدیۃ

اس کتاب کے مؤلف المؤید فی الدین ہبۃ اللہ بن موسیٰ بن داؤد الشیرازی (۳۹۰-۴۷۰ھ) ہیں۔ یہ فاطمی سلطنت کے زبردست داعی تھے۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں اپنی زندگی کے ایک متعین مرحلہ (۴۲۹ تا ۴۵۰ھ) کی تصویر کشی کی ہے۔ ۲۷ یہ وہی مؤید ہیں جن کے ابوالعلاء المعری سے گوشت کھانے سے اجتناب اور نباتات پر اکتفا کرنے کے سلسلے میں طویل مراسلت ہوئی تھی۔ یہ بلندی درجات اور جاہ وعزت کے حد سے زیادہ طلب گار تھے۔ مشہور بویہی فرماں روا ابوکالیجار کو انھوں نے اپنے اسماعیلی مذہب کا حامی بنالیا، جب کہ وہ اس کا بے حد مخالف تھا۔ پھر اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ایران سے مصر گئے، یہاں فاطمیوں نے انہیں کوئی خاص مقام نہیں دیا۔ چنانچہ وہ پوری سلطنت میں سرگرداں رہے یہاں تک کہ بساسیری کے ساتھ مل کر خلافت عباسیہ کے خلاف سازش کی۔ اس میں انھیں کامیابی ملی اور بغداد کے منبروں پر فاطمی خلیفہ کے نام

کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ مؤید کی نظر میں یہ پورا زمانہ بے حد اہم تھا۔ وہ یہ دیکھ کر کہ کسی مؤرخ کا قلم اس کا حق ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، انھوں نے خود اس کام کی انجام دہی کا عزم کیا اور اس کے نتیجے میں یہ کتاب منظر عام پر آئی۔

مؤید نے اس کتاب میں تفصیل سے ان واقعات اور حادثات کو بیان کیا ہے جو ابو کالیجار کے دربار میں پیش آئے اور اپنے خلاف ہونے والی ان سازشوں کا ذکر کیا ہے جن کے باعث اسے ایران چھوڑ کر مصر جانا پڑا اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں، اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ کیسے بساسیری کے ساتھ مل کر خلافت عباسیہ کے خلاف سازش کرنے میں کامیابی ملی؟ اس کے اسباب وعوامل کیا تھے؟ ۲۸ ان امور کے علاوہ کتاب میں جگہ جگہ دوسرے دینی، فقہی اور معاشرتی امور کا تذکرہ ہے۔ ان سے مصنف کی قوتِ مناظرہ اور بحث وجدال کا ثبوت ملتا ہے۔

کتاب میں مصنف کے تین اہم مراحلِ حیات کی تصویر کشی تین الگ الگ ابواب میں کی گئی ہے۔ یہ کتاب چونکہ ایک پرآشوب دور کی یادگار ہے اس لیے اس کی تاریخی، معاشرتی اور سیاسی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استاذ محمد حسین کامل نے اِسے صرف مصنف کی سوانح حیات نہیں، بلکہ پورے نصف صدی کی تاریخ کا ایک اہم مأخذ قرار دیا ہے۔ ۲۹ بلاشبہ مصنف کا اپنے زمانے کے حالات سے بڑا گہرا ربط وتعلق تھا، اس لیے اس عہد کے بارے میں تفصیلی معلومات ان کی اس کتاب سے مل جاتی ہیں۔

کتاب کی اس اہمیت کے باوجود اس پر بعض اعتراضات بھی کئے گئے ہیں۔ ایک اعتراض یہ ہے کہ مصنف نے بہت سے پرپیچ مسائل میں کوئی واضح موقف اختیار نہیں کیا ہے اور دوسرے فاطمی مبلغین کی طرح پردہ داری سے کام لیا ہے۔ خود اپنی زندگی کی بہت سی تفصیلات سے پردہ نہیں اٹھایا ہے۔ ان کی ابتدائی زندگی (پیدائش سے لے کر تعلیم وتربیت تک) بالکل پردۂ خفا میں ہے۔ ۳۰ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان کا اسلوب پیچیدہ ہے۔ اس میں سلاست اور روانی نہیں ہے۔ سجع کا بہ کثرت استعمال ہے،

جب کہ خود مصنف نے ابوالعلاء کے بعض رسائل میں اسے عیب قرار دیا تھا۔۳۱ تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ کتاب میں غرور اور تعلّی کے احساسات غالب ہیں، ہر جگہ اپنے وقار اور اَنا کا تحفّظ کیا گیا ہے۔ ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ واقعات کی تاریخ وغیرہ کا ذکر نہیں ہے، چنانچہ پانچویں صدی ہجری کی کسی تاریخی کتاب کی مدد کے بغیر بہت سی باتیں واضح نہیں ہو پاتی ہیں۔۳۲

مذکورہ بالا بیش تر اعتراضات اپنی جگہ پر صحیح ہیں، لیکن اس سے قطع نظر بہ حیثیت ایک خود نوشت اس کی اہمیت مسلم ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین کامل نے اپنی کتاب 'فی أدب الفاطمية' میں اسے اپنے موضوع پر بہترین کتاب قرار دیا ہے اور اس کو عربی زبان میں خودنوشت سوانح نگاری کی اولین کوششوں میں شامل کیا ہے۔۳۳

۳- التعريف بابن خلدون و رحلته غرباً و شرقاً

علامہ ابن خلدون کا زمانہ بھی پرآشوب، پرپیچ اور اضطراب انگیز رہا ہے، چنانچہ انھوں نے اپنی سوانح قلم بند کی اور اس میں اپنی ابتدائی زندگی کی تفصیلات بھی فراہم کردیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں ان کے خطوط اور اشعار کی بھی معتدبہ تعداد ہے۔ لیکن اس کی تالیف کا بنیادی مقصد کچھ امور کی وضاحت اور تفصیل پیش کرنی تھی۔ ان پر یہ الزام تھا کہ اندلس میں انھوں نے بہت سے انقلابات میں شرکت کی ہے۔ لوگ، یہاں تک کہ ان کے دوست لسان الدین ابن الخطیب بھی انھیں ناپسند کرنے لگے تھے۔ اسی طرح مصر میں انھیں متعدد بار قضا کی ذمہ داری سونپی گئی، لیکن ہر بار انھیں معزول کردیا گیا، اس سے یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ اس کا سبب لوگ خود ان کو قرار دینے لگیں۔

مذکورہ دو اسباب اور بعض دوسرے اسباب کی بناپر انھوں نے اپنی خود نوشت تحریر کی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی کی جزئیات کا اِحاطہ کرنا اپنا مقصود نہیں بنایا تھا، چنانچہ اپنی ابتدائی بیس سال کی زندگی چند صفحات میں سمیٹ دی اور بچپن و نوجوانی کے بہت سے امور و مسائل سے تعرض نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی علمی اور سیاسی تاریخ لکھنا زیادہ مقدم سمجھتے تھے، خاص طور

سے وہ سیاسی حالات کا تجزیہ کرنا چاہتے تھے۔ اپنی کتاب میں تاریخ اور سنین لکھنے کا انھوں نے بہت زیادہ اہتمام کیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے اساتذہ، شیوخِ طریقت اور ساتھیوں کے بہت سے واقعات کی تاریخ بھی لکھ دی ہے۔[۳۴] یہ اس کتاب کا ایک اہم وصف ہے۔ اس میں خاص طور سے اس عتاب کا ذکر ہے جو مختلف حکم رانوں کی طرف سے ان پر نازل ہوتا رہا اور انھوں نے ہر ایک کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ ان کی طرف سے اس وقت بھی، جب یہ واقعات پیش آئے اور ان واقعات کو قلم بند کرتے وقت بھی، کسی طرح کا منفی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ یہ بڑے ظرف کی بات ہے۔[۳۵]

ابن خلدون کی اس کتاب پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں مراسلات کی کثرت ہے۔[۳۶] مراسلات اگر بہ قدر ضرورت نقل کر لیے جائیں تو کوئی حرج نہیں، لیکن اس کتاب میں طویل مراسلات بے موقع اور بے محل نقل کیے گئے ہیں۔ ابن خلدون کو خود اس کا احساس تھا کہ ان سے کتاب کا مقصد فوت ہو جائے گا، لیکن وہ اسے افادۂ عام کے لیے نقل کرنے پر مصر تھے۔ وہ صرف اپنے مراسلات ہی نہیں، بلکہ دوسروں کے مراسلات بھی نقل کرتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے ساتھی ابنِ خطیب کے دس صفحہ کے ایک مراسلے کو پورا نقل کر دیا ہے۔[۳۷] اسی طرح اس کتاب پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں بعض واقعات و حادثات کی تکرار ہے اور بعض واقعات مقصد سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ علامہ ابن خلدون ان کے نقل کرنے کو حق بہ جانب قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے قاری کو مراجعت میں آسانی ہوگی۔[۳۸] اس کتاب پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس میں ابن خلدون کے فکری ارتقا، اسلوب تحریر اور فلسفۂ زندگی کے بارے میں تفصیلات نہیں ہیں۔

ان اعتراضات کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ کتاب ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ اس میں ایک زمانے کے سیاسی اور معاشرتی احوال کی بہترین تصویر بیان کر دی گئی ہے۔ ان احوال سے مصنف کا خود گہرا تعلق تھا۔ تفصیلات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مضبوط اور معتدل شخصیت کے مالک تھے۔ قضا کی ذمہ داریوں کی

انجام دہی میں انھوں نے حق کا دامن ہمیشہ تھامے رکھا۔ ان کے خلاف سازشیں کی گئیں، انھیں متعدد بار معزول کیا گیا، لیکن وہ جادۂ حق سے کبھی منحرف نہیں ہوئے۔ اولاً وہ قضا کی ذمہ داری قبول کرنے سے گریز کرتے تھے، لیکن بادشاہِ وقت کی طرف سے کسی اصرار کو ٹالتے بھی نہیں تھے۔ عزل ونصب کے سلسلے میں بادشاہِ وقت کے تمام اقدامات کو وہ قبول کرتے تھے اور ان پر کوئی ردِّعمل ظاہر نہیں کرتے تھے۔۳۹

۴- کتاب الاعتبار

یہ کتاب مشہور مردِ مجاہد اسامہ بن منقذ (م۵۸۴ھ) کی یادگار ہے۔ مذکّرات کی نوعیت کی یہ کتاب مصنف کی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو عام فہم انداز میں پیش کرتی ہے۔ اپنی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر اسے چھٹی صدی ہجری کے حالات وواقعات کے بارے میں واقفیت کا ایک بہترین ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مصنف نے اس میں خاص طور سے شام اور مصر کے اسلامی معاشرے اور صلیبی جنگوں میں اپنی شرکت اور شجاعت وجواں مردی کے واقعات بیان کیے ہیں۔ عہد ایوبی میں صلیبی جنگوں کا جو طویل سلسلہ رہا ہے اس کے بارے میں یہ کتاب بیش قیمت مواد فراہم کرتی ہے۔ کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس کا مصنف بہترین شاعر، ادیب اور سپہ سالار تھا، اس لیے اسے کوئی واقعہ قلم بند کرنے میں دقّت پیش نہیں آئی۔ واقعات کی جمع وتدوین میں صداقت، امانت اور عدل وانصاف کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کا اعتراف مسلم محققین کے علاوہ مستشرقین کو بھی ہے۔۴۰

کتاب کا مرکزی موضوع مصنف کی جواں مردی اور شجاعت کا بیان ہے۔ مصنف نے بچپن کی زندگی سے ایسے واقعات نقل کیے ہیں جو اس کی بہادری پر دلالت کرتے ہیں۔ اس جوہرِ گراں مایہ کی دیکھ ریکھ اور تزئین وآرائش میں ان کے والد کی تربیت کا خصوصی دخل تھا۔ وہ ان کے کسی بھی جرأت مندانہ اقدام پر نکیر نہیں کرتے تھے۔۴۱

مصنف کو شکار کھیلنے سے بھی بہت زیادہ دل چسپی تھی۔ اس سے متعلق کئی واقعات کتاب میں ذکر کیے گئے ہیں، جو ان کی بے خوفی، ہمت اور حوصلے کی بہترین دلیل ہیں۔ اسی طرح صلیبیوں کے ساتھ معرکہ آرائی کے بے شمار واقعات مذکور ہیں۔

مصنف نے اس کتاب میں یہ فلسفہ بار بار دہرایا ہے کہ 'موت کا ایک وقت متعین ہے، یہ اپنے وقت پر آئے گی، انسان اگر جلدی مرنا چاہے تو یہ اس کے لیے ممکن نہیں، خواہ وہ کتنے ہی بڑے خطرات میں اپنے کو ڈالتا رہے'۔۴۲

کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں مسلم اور عیسائی مردوں اور عورتوں کی نفسیات اور طبائع کا بہترین مطالعہ کیا گیا ہے۔ قاری اسے پڑھ کر دل چسپی کا بہت سا سامان پالیتا ہے۔ اس میں اپنی ذات کی مبالغہ آمیز مدح وتوصیف بھی نہیں ہے۔ البتہ اس کتاب کی کمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں زبان کہیں کہیں بے ربط معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف نے پیرانہ سالی میں اسے ترتیب دیا اور کسی کی مدد سے اسے مدون کیا۔ یہی وجہ ہے کہ غلطیاں باقی رہ گئی ہیں۔ کتاب میں عوامی زبان کے الفاظ اور ترکیبیں بھی ہیں، کیونکہ مصنف کا عوامی زندگی سے گہرا رابطہ تھا اور وہ اس کتاب کو ہر طبقہ کے لوگوں کے لیے لکھ رہا تھا۔

۵- المنقذ من الضلال

یہ کتاب مشہور اسلامی مفکر اور فلسفی امام غزالیؒ کی تحریر کردہ ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے اندرون میں برپا اس کش مکش کی تصویر کھینچی ہے جو فکر وفلسفہ کی وادیوں میں سرگرداں ہونے کی وجہ سے انھیں درپیش تھی۔۴۳ حتّٰی کہ شدید روحانی اضطراب وانتشار سے دوچار ہونے کے بعد انھیں حق کی معرفت ہوئی اور ریب وتشکیک کا زمانہ ختم ہوا۔ وہ اس کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھیں علم و معرفت کی راہ میں مشکلات ومصائب برداشت کرنے کا شوق بچپن سے تھا۔ وہ ہر بات کا تنقیدی مطالعہ کرتے تھے۔ تقلید واتباع ان کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ اپنی اس طبیعت کی وجہ سے وہ تمام موروثی عقائد اور روایات پر شک کرنے لگے۔ حقیقت کی تلاش میں انھوں نے مختلف فلسفیانہ مسالک کا مطالعہ کیا، لیکن کہیں تشفی نہیں ہوئی۔ آخر کار تصوف کا مطالعہ کیا اور یہاں ان کی متاعِ گم شدہ انھیں حاصل ہوگئی۔ وہ صوفیہ سے بے حد متأثر ہوئے اور انھیں اپنا آئیڈیل بنایا۔ اس نئی یافت کے بعد وہ دنیا اور اس کے علائق سے کنارہ کش ہوگئے ، حالاں کہ ان

کے ساتھیوں نے انھیں روکا، لیکن وہ بغداد میں اپنا علمی و تدریسی حلقہ چھوڑ کر شام، فلسطین اور حجاز چلے گئے، آخری وقت میں پھر بغداد لوٹ آئے، لیکن اپنی قلبی کیفیت کی تسکین و تسلی کے لیے وہ برابر تصوف سے جڑے رہے۔ کیوں کہ یہی مسلک ان کے نزدیک مبنی برحق تھا۔[۴۴]

امام غزالی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی روحانی سراسیمگی اور قلبی اضطراب کی پوری تصویر کھینچ دی ہے۔ کسی بات کو کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ امت کے درمیان امام غزالی کو جو مقام حاصل تھا اس کی بنا پر اگر وہ چاہتے تو بہت سی باتیں چھپالے جاتے، کم از کم عقائد میں اپنے ریب و تشکیک کا تذکرہ نہ کرتے۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی نفسیاتی اور ذہنی کیفیت بیان کرنے پر بھرپور قدرت رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں جس طرح انھوں نے مختلف مواقع پر اپنے اندرونی جذبات و احساسات کی تعبیر کی ہے وہ ان کی قوتِ بیان اور اظہار مافی الضمیر کی بہترین مثال ہے۔

۶- مذكرات الأمير عبدالله

یہ کتاب، جیسا کہ نام سے واضح ہے، غرناطہ کے آخری مسلم فرماں روا امیر عبداللہ کی خود نوشت ہے۔ ان کی زندگی سازشوں، آزمائشوں اور تباہیوں کے درمیان گزری۔ انھیں ایک طرف عیسائیوں کا مقابلہ کرنا تھا تو دوسری طرف مرابطین کے فرماں روا یوسف بن تاشفین کی ناراضی، عتاب اور حملے سے بچنا تھا۔ حکومت کم زور ہو چکی تھی اور مفاد پرست وزراء اور امراء دونوں طرف ساز باز کر کے امیر عبداللہ کو ہر طرح سے مفلوج کر دینا چاہتے تھے۔ افواہوں کا بازار گرم تھا اور امیر کے ہر عمل اور حرکت کی غلط اور بے بنیاد تعبیر پیش کی جا رہی تھی۔[۴۵] ان حالات میں امیر نے اپنی خودنوشت لکھنے کا فیصلہ کیا اور اپنے خلاف عائد کردہ تمام الزامات کا جواب دیا اور اپنے تمام اقدامات اور اپنی تمام پالیسیوں کی وضاحت کی۔ انھوں نے صورت واقعہ بلا کسی کمی یا زیادتی کے لوگوں کے سامنے رکھ دی۔

یہ کتاب جلاوطنی کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ مرابطین

نے اس کے مصنف کو خالی ہاتھ، بے یار و مددگار غرناطہ سے نکال دیا۔ ایک شخص جو کبھی ہر چیز کا مالک رہا ہو اس کے لیے ویرانی، بے سروسامانی اور تنہائی کی زندگی کتنی اذیت ناک ہوگی اسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس عالم میں انسان جو کچھ لکھتا ہے اس میں جذبات کی حرارت اور حقائق کی صداقت کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ امیر عبداللہ کی خودنوشت میں یہ سب کچھ ہے، اس کے مطالعہ سے قاری بے حد جذباتی ہوجاتا ہے۔[۴۶] اور اس کی تمام ہم دردیاں مصنف کے ساتھ ہوجاتی ہیں۔ امیر عبداللہ نے اس کتاب سے اپنا دفاع کرنا چاہا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت ہر طرح کے دفاع سے بالاتر ہے۔ تاریخ خود صحیح اور غلط کو واضح کردیتی ہے۔

اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف کی ذاتی زندگی اور نجی حالات کے ساتھ ساتھ اندلس کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا بھی صاف اور واضح نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ ایک قیمتی تاریخی دستاویز قرار پاتی ہے جس سے مصنف کی شخصیت اور اس عہد کے معاشرے کی صورت حال دونوں کے حقائق نمایاں ہوکر سامنے آجاتے ہیں۔ اس کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کا انداز بیان ادبی ہے۔ امیر عبداللہ کا امتیاز ہی ان کا شیریں اور دل چسپ ادبی اسلوب ہے۔ اس میں مکالمات کو اس طرح فنی قالب میں پیش کیا گیا ہے کہ پوری صورت حال اپنی حقیقی شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان مکالمات کو جان دار انداز میں پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت حاصل تھی۔ انھوں نے زندگی کے واقعات میں حرکت اور حرارت پیدا کردی اور اسے خیال اور تصور کی جس مقدار سے مزین کردیا، عربی خودنوشتوں میں اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ اس لیے اپنی خوبیوں کی بنیاد پر یہ کتاب قارئین کی جمالیاتی حس کو بیدار کردیتی ہے اور اس کے اندر مزید مطالعہ کا شوق پیدا کرتی ہے۔ اسے بار بار پڑھنے سے اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ڈرامہ یا افسانہ ہے، حالانکہ بات ایسی نہیں ہے۔ یہ اس کی فنی خوبی ہے۔ مصنف کی پیش کش کا انداز ہی نرالا ہے۔[۴۷]

حواشی ومراجع

۱ القاموس المحیط ، فیروز آبادی،۲/ ۵۶
۲ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور
۳ علم التاریخ عند المسلمین، روزنتال، ترجمہ الدکتور صالح احمد العلی، ص ۱۴۱
۴ الترجمۃ الذاتیہ، یحییٰ ابراہیم، ص ۳۱
۵ الموت والعبقریۃ، عبدالرحمان بدوی، ص ۱۱۹
۶ ناشر: دارالکاتب العربی ۱۹۴۹ء
۷ ناشر: دارالمعارف، مصر ۱۹۵۵ء
۸ ناشر: اللجنۃ، مصر ۱۹۵۱ء
۹ ناشر: مکتبۃ الانجلو ۱۹۵۲ء
۱۰ عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ابن ابی اصیبعہ، الہیئۃ، ۱۸۸۲ء
۱۱ تحقیق محمد کرد علی- ط احمد عبید بدمشق
۱۲ تحقیق فیلپ حتی، ط- برنستون
۱۳ ط- قاہرہ ۱۹۵۵ء
۱۴ عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ابن ابی اصیبعہ، الترجمۃ الشخصیۃ، شوقی ضیف، ص ۱۲/ ۳۶
۱۵ فن التراجم، عادل غضبان، مجلۃ الکتاب، ج ۷، اپریل ۱۹۴۹ء، ص ۵۰۷-۵۰۸
۱۶ حضارۃ الاسلام، جرد ینام، ترجمہ عبدالعزیز توفیق، ص ۴۴۷-۴۴۸
۱۷ فن السیر ۃ، احسان عباس، ص ۱۲۱-۱۲۲
۱۸ ایضاً، ص ۱۲۳
۱۹ الموت والعبقریۃ، عبدالرحمان بدوی، ص ۱۱۵
۲۰ قدیم عربی خود نوشت کی تفصیلات، طبقات الاطباء، از ابن ابی اصیبعہ، الموت والعبقریۃ، ازعبدالرحمان بدوی اور معجم الأ دباء از یعقوب حموی سے مأ خوذ ہیں۔
۲۱ الترجمۃ الشخصیۃ، شوقی ضیف، ص ۱۲، ۹۳
۲۲ طبقات الاطباء، ابن ابی اصیبعۃ، ج ۲، ص ۲، ۳، ۹۲، ۹۹

۲۳ فن السیر ۃ، احسان عباس، ص ۱۲۱
۲۴ طوق الحمامۃ، ابن حزم، ص ۲۹
۲۵ فن السیر ۃ، احسان عباس، ص ۱۲۲-۱۲۳
۲۶ اس کی ایک مثال کتاب کے صفحہ نمبر ۶۲ پر موجود ہے۔
۲۷ السیر ۃ المؤیدیۃ، المؤید فی الدین، دار الکتاب العربی المصری، ۱۹۴۹ء
۲۸ السیر ۃ المؤیدیۃ، ص ۶۰-۶۹
۲۹ فی ادب مصر الفاطمیۃ، محمد کامل حسین، ص ۱۱۶
۳۰ مقدمہ محمد کامل حسین لکتاب السیر ۃ المؤیدیۃ، ص ۱۳
۳۱ فن السیر ۃ، احسان عباس، ص ۱۳۰
۳۲ دیوان المؤید، تحقیق محمد کامل حسین ص ۱۶۹
۳۳ ایضاً، ص ۱۱۷
۳۴ التعریف بابن خلدون، ابن خلدون، ص ۱۲، ۶۰
۳۵ ایضاً، ص ۶۷
۳۶ ایضاً، ص ۸۲-۸۴
۳۷ ایضاً، ص ۱۳۰
۳۸ ایضاً، ص ۲۷۸
۳۹ فن السیر ۃ، احسان عباس ص ۱۲۰
۴۰ مقدمہ فلیب حتی لکتاب الاعتبار، ص ب
۴۱ کتاب الاعتبار، ص ۱۰۲
۴۲ کتاب الاعتبار، ص ۱۶۲
۴۳ المنقذ من الضلال، الغزالی، ص ۳۳-۴۰
۴۴ ایضاً، ص ۵۱
۴۵ مذکرات الأمیر عبداللہ، ص ۱۲۱
۴۶ بطور مثال کتاب کا صفحہ نمبر ۱۵۸ دیکھا جا سکتا ہے۔
۴۷ الترجمۃ الذاتیۃ، دکتور یحییٰ ابراہیم، ص ۴۱

اسلامی تناظر میں مالیاتی پالیسی

ڈاکٹر اوصاف احمد

جدید اقتصادیات میں بازارِزر (Money market) کی نگرانی (Regulation) نگہبانی (Supervision) اور انتظام وانصرام (Management) کو محض ایک فقرے 'مالیاتی پالیسی' (Monetary Policy) میں سمیٹ لیا جاتا ہے، جس کے ذریعہ ذمہ دار افراد، معیشت کو چلانے اور اس کی نگرانی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ مالیاتی پالیسی اب ایک ایسا اہم ذریعہ بن گئی ہے جس کے ذریعہ جدید معیشت کو ہموار بنانے کا (Fine-tuning) کام کیا جاتا ہے۔ اسلامی بنک کاری کے ظہور اور بعض مسلم ممالک کے اس اعلان کے بعد کہ وہ اپنے ملک میں اسلامی بنک کاری کا نفاذ پورے طور پر کرنا چاہتے ہیں، اسلامی نقطۂ نظر سے مالیاتی پالیسی کا سوال اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے کہ اسلامی بینکوں کی موجودگی میں مالیاتی پالیسی کا نفاذ کس طور پر ہوگا؟ کیا اسلامی معیشت میں مالیاتی پالیسی کا نفاذ اسی طرح ہوگا جیسے کہ کسی جدید سرمایہ دارانہ معیشت میں ہوتا ہے یا اس سے کچھ مختلف ہوگا؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو اختلاف کی صورتیں کیا ہوں گی؟ اسلامی معیشت میں مالیاتی پالیسی کے مقاصد کیا ہوں گے؟ اسلامی معیشت میں مالیاتی پالیسی کے نفاذ کے لیے کون سے ذرائع/آلات (Instruments) فراہم ہوں گے؟ کیا یہ ذرائع ان ذرائع کے مماثل ہوں گے جو آج کل کسی بھی جدید معیشت میں مستعمل ہوتے ہیں یا ان میں کچھ ترامیم درکار ہوں گی؟ یا ہم کو بالکل نئے ذرائع وضع کرنے ہوں گے؟ اسلامی معیشت میں مالیاتی پالیسی کی مجوزہ تشکیل سے قبل یہ اور اس قسم کے بعض دوسرے سوالات کے مناسب اور تشفی بخش جوابات ڈھونڈنا لازم ہوگا۔

اسلامی معیشت میں مرکزی بینک کا کردار

جدید معاشی نظام میں مرکزی بینک مندرجہ ذیل وظائف ادا کرتا ہے:

۱- معیشت کی ضروریات کے مطابق زر کی فراہمی پر کنٹرول اور نگرانی۔

۲- بینکوں کے ذریعہ فراہم کیے جانے والے قرضوں کی مناسب جہتوں میں منتقلی۔

۳- محفوظ بینک کاری کے مقاصد کا حصول۔

اسلامی معاشیات کے ماہرین کا قیاس یہی ہے کہ اسلامی معیشت میں بھی مرکزی بینک کو یہ وظائف انجام دینا ہوں گے۔ اسلامی معیشت میں بھی مرکزی بینک کو اعلیٰ قوت زر (High Powered Money) کی فراہمی جاری رکھنی ہوگی۔ مالیات اور سرمایہ کاری کو ایسے زمروں میں لے جانا ہوگا جو سماجی نقطۂ نظر سے زیادہ قابل ترجیح ہوں اور سماجی ترجیحات کے مطابق قومی وسائل کی تقسیم پر اثر انداز ہونا ہوگا، نیز تجارتی بینک کاری نظام کی کارکردگی پر نظر رکھنی ہوگی، اُسے مزید موثر بنانا ہوگا۔ تاہم تجزیہ کاروں کو اس حقیقت پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی کہ اسلامی معیشت میں بھی تجارتی بینک منافع کمانے والے نجی اداروں کی حیثیت رکھیں گے، جس طرح کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ان کے شریک کار بینک منافع کمانے والے ادارے (Profitmaking entitles) ہوتے ہیں۔ گو کہ اسلامی معیشت میں بینک اپنے اعمال اسلام کے سماجی اور معاشی فلسفہ کی رہنمائی میں رنجام دیں گے اور شریعت کے مقرر کردہ اہداف کے حصول کے لیے کوشاں رہیں گے، لیکن ان کے تجارتی اعمال میں سے بیش تر کا محرک منافع کا حصول ہوگا۔ اس لیے کسی ایسے ادارے کی ضرورت ہوگی جو کہ ان مختلف النوع تجارتی اداروں کے درمیان توازن اور اعتدال پیدا کر سکے اور مشترکہ سماجی و معاشی مقاصد کے حصول میں ان اداروں کا مدد و معاون ہو سکے۔ طبعاً، ملک کا مرکزی بینک ایک ایسا مناسب ادارہ ہوگا جو اس کردار کو کماحقہٗ نبھا سکے۔

اسلامی بینک اور تخلیق زر

عام طور پر کسی جدید معیشت میں مالیاتی پالیسی کی کارکردگی اور تجارتی بینکوں

کے کنٹرول کی وسعت اور پھیلاؤ کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ تجارتی بینک تخلیقِ زر میں حصہ لیتے ہیں اور معیشت میں زر کی فراہمی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں اسلامی معیشت کے حوالہ سے ہمیں ان سوالوں کا جواب دینا ہوگا کہ کیا اسلامی بینک بھی اپنے تجارتی اعمال کے ذریعہ تخلیقِ زر کرتے ہیں؟ کیا اسلامی بینک کاری نظام میں مضاعف تخلیق جمع (Multiple Deposit Creation) اسی طرح ہوسکتی ہے جس طرح کہ سرمایہ دارانہ نظام کی نجی بینک کاری میں ہوتی ہے۔ اس نکتہ پر اسلامی معاشیات کے ماہرین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اسلامی بینک کاری، روایتی بینک کاری سے یکسر مختلف ہے، اس لیے اسلامی بینک کاری میں مضاعف تخلیق جمع ممکن نہیں ہے۔ اس گروہ کی دلیل یہ ہے کہ روایتی بینک کاری نظام کا انحصار قرض کے تصور پر ہے۔ روایتی نظام میں بینک کی تعریف یہی ہے کہ یہ (بینک) جمع وصول کرنے اور قرض دینے والا ادارہ ہے۔ چونکہ روایتی نظام میں بینک منافع حاصل کرنے والا ادارہ بھی ہوتا ہے اس لیے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی فکر میں تجارتی بینک زیادہ سے زیادہ قرض دینے کی دھن میں لگ جاتے ہیں۔ اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ زر کی طلب و رسد کا توازن بگڑ جاتا ہے، معیشت میں زر کی رسد میں اضافہ ہوجاتا ہے، شرح سود گرتی ہے جس سے سرمایہ کاری میں کمی واقع ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ آمدنی، اور روزگار کی سطح بھی نیچے آنا شروع ہوجاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی بینک کاری میں قرض کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا، قرض کے بجائے اسلامی بینک 'مضاربۃ' کے تصور پر کام کرتے ہیں اور تجارتی لوگوں کو 'مضاربۃ' کی بنیاد پر وسائل فراہم کیے جاتے ہیں۔ ہر مضاربۃ کے ساتھ معیشت کی پیداواری صلاحیت میں اسی تناسب سے اضافہ ہوتا ہے۔ جب معیشت کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کا امکان نہیں ہوتا تو مضاربہ فنڈس کی طلب بھی رک جاتی ہے۔ اس لیے اسلامی بینک کاری نظام میں بینکوں کے ضرورت سے زیادہ قرض دینے کا امکان نہیں ہوتا۔ 'مضاربۃ' کے ذریعہ نظام بینک کاری فقط اتنی مقدار میں مالی وسائل فراہم کرے گا جس کو معیشت کی پیداواری صلاحیت بخوبی جذب کرسکے۔ اس لیے ان مفکرین کی رائے میں اسلامی بینک کاری نظام میں غیر ضروری تخلیق زر کے ذریعہ پیدا ہونے والے معاشی

عدم استحکام کی گنجائش نہیں۔

اس کے برعکس اسلامی اقتصادیات کے ماہرین کا دوسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ اسلامی بینک کاری میں بھی تخلیق زر اسی طرح ممکن ہے جس طرح کسی جدید معیشت میں۔ ان مفکرین کی نگاہ میں اوپر دیے گئے دلائل نا قابل تردید نہیں ہیں۔ یہ ماہرین اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ نظام بینک کاری خواہ روایتی ہو یا اسلامی، تخلیق زر کسی ایک بینک کا کام نہیں ہے۔ تخلیق زر کی اساس اس حقیقت پر ہے کہ بینک کے ذریعہ اُدھار دیا گیا۔ روپیہ گھوم پھر کر بینک کاری نظام کے اندر ہی رہتا ہے۔ اس لیے تخلیق زر، پورے نظام بینک کاری کی کارکردگی کا نتیجہ ہوتی ہے نہ کہ کسی ایک بینک کا۔ ان مفکرین کا اصرار ہے کہ مضاعف تخلیق جمع (Multiple Dipcsit Creation) مندرجہ ذیل دو عوامل کے باعث ظہور میں آتا ہے:

۱- کسی ایک بینک کے ذریعہ دیا گیا قرض (خواہ وہ سودی قرض ہو یا مضاربۃ کی بنیاد پر ہو) نظام بینک کاری سے باہر جا ہی نہیں سکتا۔ وہ کسی دوسرے بینک میں جمع (deposit) کی شکل میں واپس آجاتا ہے جس کے مقابلہ میں مزید قرض دیا جاسکتا ہے۔

۲- اصل میں یہ جزوی نظام محفوظ اثاثہ جات (Fractional Reserve system) مضاعف تخلیق جمع کا اصل سبب ہے۔ اس لیے بعض اصحاب، جو معاشی استحکام کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، وہ نظام بینک کاری میں سو فی صد محفوظ اثاثہ جات کا نظام (100% Reserve Requirement System) قائم کرنے کے حق میں ہیں۔

اگر اسلامی نظام بینک کاری میں مندرجہ بالا دو خصائص پائے جائیں تو اس کو بھی مضاعف تخلیق جمع کی قوت حاصل ہوگی۔ اگر اسلامی بینک کاری کا نظام کلیۃً مضاربت کے نظام پر قائم ہو تو اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ وہ شرائط تبدیل ہوگئی ہیں جن کی بنا پر بینک رقوم کی پیشگی ادائیگی کیا کرتا تھا۔

اسلامی معیشت میں مالیاتی پالیسی کے مقاصد

کسی بھی معیشت میں مرکزی بینک کی مالیاتی پالیسی کی تشکیل و تنفیذ حکومت کی

عام معاشی پالیسی کے خطوط کے اندر ہی ہوسکتی ہے، تاکہ دونوں پالیسیوں میں کسی قسم کا تناقض نہ رہے اور دونوں پالیسیاں ایک دوسرے کی مد و معاون ہوں۔ ایک بااختیار مالیاتی پالیسی (Discretionary Monetary Policy) کے وجود کی سب سے بڑی وجہ تو یہی ہے کہ نظام بینک کاری سے تعلق رکھنے والے ہر تجارتی بینک کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ جس راہ پر چاہے گامزن ہو۔ ضروری ہے کہ معیشت میں کوئی ایسا طریقہ موجود ہو جس کے ذریعہ مختلف بینکوں کی قرض پالیسی (Credit Policy) اور سرمایہ کاری پالیسی (Investment Policy) میں ہم آہنگی پیدا کی جاسکے اور اس طرح معاشی پالیسی کے عام سماجی مقاصد کے حصول کو ممکن بنایا جاسکے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مالیاتی پالیسی کے بعض مقاصد متعین کیے جائیں، جن کا حصول سماجی نقطۂ نظر سے پسندیدہ ہو۔ ایک مرتبہ مقاصد کا تعیّن ہوجائے تو ان ذرائع کی نشان دہی بھی ضروری ہے جن کے ذریعہ ان مقاصد کو حاصل کیا جائے گا۔

قیمتوں میں استحکام، ادائیگی کے نظام میں توازن، معاشی نمو، اور معاشی انصاف، کسی جدید معیشت میں مالیاتی پالیسی کے عام مقاصد کہے جاتے ہیں۔ یہاں پر یہ سوال اٹھانا مناسب ہوگا کہ کسی اسلامی معیشت میں مالیاتی پالیسی کے مقاصد یہی ہوں گے یا اس سے مختلف ہوں گے؟ اسلامی معاشیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ کوئی ضروری نہیں کہ اسلامی معیشت میں یہ مقاصد مختلف ہوں، تاہم دوسری معیشتوں کی طرح اسلامی معیشت میں بھی مالیاتی پالیسی کے مقاصد، حکومت کی عام معاشی پالیسی سے اخذ کیے جائیں گے۔ آج کل زیادہ تر ترقی پذیر ممالک میں، جن میں بیش تر اسلامی ممالک بھی شامل ہیں، مالیاتی پالیسی کے عام مقاصد میں مندرجہ ذیل امور شامل ہوتے ہیں:

۱- ملک میں مسلسل اور متوازن معاشی نمو کا فروغ اور معاشی ترقی کے لیے ضروری وسائل کی فراہمی۔

۲- زر کی قدر میں استحکام کا حصول، تاکہ افراط و تفریط زر کے نقصان دہ نتائج سے بچا سکے۔

۳- ملک کی کرنسی کی بیرونی قدر میں استحکام۔

۴- آمدنی اور دولت کی منصفانہ تقسیم کا حصول

اسلامی معیشت میں مالیاتی پالیسی کے ذرائع

[INSTRUMENTS OF MONETARY POLICY IN ISLAMIC ECONOMY]

آج کل کسی جدید معیشت میں مالیاتی پالیسی کا نفاذ اس ملک کے مرکزی بینک کے ذریعہ کیا جاتا ہے جو اس کے مقاصد کے حصول کی خاطر متعدد ذرائع (یا تدابیر) کا استعمال کرتا ہے۔ ان تدابیر کو موٹے طور پر تین قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے:

۱- مقداری تدابیر (Quantitative Measures)

۲- کیفیاتی تدابیر (Qualitative Measures)

۳- احتیاطی تدابیر (Prudential Measures)

مقداری تدابیر کی مثالیں یہ ہیں: قانونی حفاظتی نسبت (Legal Reserve Ratio) بینک شرح کی پالیسی (Bank rate Policy)، کھلے بازار کے اعمال (Open market operations) اور قرض کی جبری تقسیم (Credit Rationing)۔ کیفیاتی تدابیر میں حاشیائی شرطیں، زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم شرح سود کی حد بندی، امدادی قرضہ اسکیمیں (Subsidized credit schemes) وغیرہ شامل ہیں۔ احتیاطی تدابیر میں متعدد ایسی تدبیریں شامل ہیں جن کا مقصد حصہ داروں (Share holders) اور جمع کنندگان (depositors) کے مفادات اور تجارتی بینکوں کا تحفظ ہے۔ مثلاً مرکزی بینک ایک حد مقرر کرسکتا ہے جس سے زائد رقم کسی گاہک کو نہ دی جائے۔ اسے Maximum Exposure Requirment کہتے ہیں۔ ان میں سے بعض ذریعے مثلاً بینک شرح پالیسی کا اسلامی معیشت میں وجود نہ ہوگا اور نہ اس سے کام لیا جاسکے گا، کیونکہ واضح طور پر اس کا تعلق شرح سود سے ہے۔

مالیاتی پالیسی کے روایتی آلات کی موزونیت

یہاں ہم مالیاتی پالیسی اور قرض پر کنٹرول کرنے والے بعض آلات کا تذکرہ

کریں گے اور اس بات کا جائزہ لیں گے کہ یہ آلات کس حد تک کسی اسلامی معیشت کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں

(الف) قانونی حفاظتی تناسب: (Legal Reserve Ratio)

بینکوں کے ذریعے دیے جانے والے قرض پر کنٹرول رکھنے کے لیے یہ ایک مقبول عام اور موثر طریقہ ہے۔ اس طریقہ میں مرکزی بینک تجارتی بینکوں کو اس بات کے لیے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی کل جمع رقم (Total deposits) کا ایک حصہ محفوظ (Reserve) رکھیں اور اسے اپنے تجارتی اعمال میں استعمال نہ کریں۔ کل جمع رقم سے ان تحفظات کا تناسب، قانونی یا مطلوبہ حفاظتی تناسب (Legal or Required Reserve Ratio) کے نام سے جانا جاتا ہے جو اپنے مخفف RRR سے زیادہ مشہور ہے۔

چونکہ مطلوبہ حفاظتی تناسب میں شرح سود کی آمیزش کسی طرح بھی نہیں ہوتی، اس لیے اس بات کا امکان ہے کہ اس طریقے کو اسلامی نظام بینک کاری میں بخوبی استعمال کیا جا سکے۔ اس اسکیم کے تحت اسلامی بینکوں کو اپنی کل جمع شدہ رقم کا ایک مخصوص تناسب محفوظ رکھنا ہوگا۔ اس تناسب میں تبدیلی کے ذریعہ مرکزی بینک اس قابل ہو سکے گا کہ اسلامی بینکوں کے اعمال میں مطلوبہ تبدیلیاں کر سکے۔

اسلامی معیشت میں اس تدبیر کے اطلاق کے سلسلے میں دو خاص تجاویز سامنے آئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مطلوبہ تناسب حفاظت (Required Reserve Ratio) کو بڑھا کر ۱۰۰ فی صد کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس تجویز کا اطلاق صرف جاری جمع Current deposit یا demand deposit پر کیا جائے اور سرمایہ کاری جمع Investment deposits کو ان سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

سو فی صد تناسب حفاظت کی دلیل یہ ہے کہ یہ نظام تخلیق زر، افراط زر اور بالآخر معاشی عدم استحکام کا سبب بنتا ہے۔ اس لیے ان مفکرین کے خیال میں تخلیق زر کی قوت انفرادی بینکوں کے بجائے اجتماعی طور پر پورے معاشرے کے پاس ہونا چاہیے اور ایک اجتماعی ادارہ ہونے کی حیثیت سے مرکزی بینک کو اس بات کا مجاز ہونا چاہیے کہ وہ

اس قوت کا مناسب استعمال کرے۔ اگر صدفی صد تناسب حفاظت کی شرط عائد کردی جائے تو تجارتی بینک صرف اُسی قدر قرض جاری کرسکیں گے جو ان کی مالی بنیاد (Monetary bases) کے مساوی ہو۔ وہ تخلیق قرض (Credit creation) نہیں کرسکیں گے۔ تخلیق قرض کی قوت مرکزی بینک کو منتقل ہوجائے گی جو قرض کی ضرورت پڑنے پر اعلیٰ درجہ کے زر (high powered money) کا مناسب طور پر اجراء کرے گا۔ اسلامی بینک کاری میں دلچسپی رکھنے والے تمام دانش ور اور علمائے اقتصاد ان خیالات سے متفق نہیں۔ ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ صدفی صد تحفّظات کا اطلاق (Imposition of 100% Reserve Requirement) بینکوں کے پَر کترنے کے مرادف ہوگا۔ جیسے پرندے پَر کترے جانے کے بعد اڑنے کے قابل نہیں رہتے، اسی طرح تجارتی بینک بھی کوئی مفید سماجی کردار ادا کرنے سے قاصر رہیں گے۔ ان کی حیثیت محض تجوریوں (safe deposit boxes) جیسی ہوجائے گی۔

اس ضمن میں ایک اور نکتہ جو سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ نظام تحفظات (Reserve system) کا اطلاق صرف عندالطلب جمع کھاتوں (demand deposit accounts) پر ہی کیا جائے اور مضاربت جمع کھاتوں یا سرمایہ کاری جمع کھاتوں کو ان سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ یہاں دلیل یہ ہے کہ مضاربۃ کھاتے تجارتی کمپنیوں کے حصص (Equities) سے مماثل ہوتے ہیں۔ اگر تجارتی کمپنیوں کے حصص نظام تحفّظات کے تابع نہیں ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مضاربۃ جمع کھاتوں کو ان کا تابع بنایا جائے۔ اس تجویز کے حامیوں کا خیال ہے کہ جمع کھاتوں کی حفاظت اور بینک کی نقد ضروریات کو ایک دوسرے سے علاحدہ رکھنا چاہیے اور ان کی خاطر نظام تحفظات کے سوا دوسری تدابیر کام میں لائی جانی چاہیے۔

یہ تجاویز بھی تنقیدی تحلیل سے بالا نہیں ہیں۔ ان تجاویز کے ناقدین یہ کہتے ہیں کہ نظام تحفظات کے دوہرے مقاصد ہیں۔ ایک جانب تو اس سے نقد ضروریات (Liquidity Requirement) پوری کرنے میں مدد ملتی ہے، دوسری جانب تخلیق

قرض پر کنٹرول بھی رکھا جاسکتا ہے ۔ تناسب نقد (Liquidity Ratio) کے ذریعہ صرف ضروریات نقد کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے، تخلیق قرض پر کنٹرول کا نہیں۔ مزید برآں، اسی طرح یہ دلیل بھی دی جاسکتی ہے کہ مضاربت کی بنیاد پر کی جانے والی جمع کے لیے قانونی نظام تحفظ کی ضرورت ہے۔ چونکہ مضاربت کی شرائط پر کی جانے والی جمع کو جمع کار (depositors) فوراً نہیں نکال سکتے، اس لیے بینک یہ پسند کریں گے کہ ان رقوم کی سرمایہ کاری ایسے طویل مدتی مشروعات میں کی جائے جن میں مستقبل میں زیادہ منافع کی توقع ہو۔ یہ امکان بھی ہے کہ زیادہ منافع کی توقع میں بینک 'مناسبت' کی حدود سے نکل جائیں اور مناسب نقدی رکھنے کی احتیاطی تدابیر کو نظر انداز کردیں۔ ایسی صورت حال میں قانونی نظام تحفظ بینکوں کو اس امر پر مجبور کردے گا کہ وہ اپنے مضاربت جمع کا ایک حصہ نقد کی صورت میں محفوظ رکھیں۔ ایسی صورت میں اسلامی بینک بھی اُسی طرح قرض کے پھیلاؤ کا کام کرسکتے ہیں جس طرح سودی تجارتی بینک کرتے ہیں۔

(ب) کھلے بازار کے اعمال (Open Market Operations)

آج کل ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں مالیاتی پالیسی کے نفاذ کا سب سے اہم اور مقبول ترین طریقہ مرکزی بینک کے ذریعہ سرانجام دیے جانے والے کھلے بازار کے اعمال ہیں۔ اسلامی معیشت میں اس طریقہ کے استعمال میں کم از کم دو اہم دشواریاں حائل ہیں۔ ان میں سے ایک دشواری تو تصوّراتی ہے اور دوسری ادارہ جاتی۔ تصوّراتی دشواری یہ ہے کہ کھلے بازار کے اعمال میں استعمال ہونے والے تمام ذرائع مثلاً سرکاری تمسّکات (Government Securities)، قصیر مدتی بانڈس، سرکاری تمسکات (Treasury bills) وغیرہ سودی کاغذات ہیں جو اسلامی نظام بینک کاری و مالیات سے میل نہیں کھاتے۔ اس لیے ان کی موجودہ شکل میں اسلامی معیشت میں ان کا استعمال ممکن نہیں ہوگا۔ ان ذرائع میں بنیادی تبدیلیاں کی جانی ہوں گی، تاکہ ایک غیر سودی معیشت میں ان کا استعمال کیا جاسکے۔ ادارہ جاتی دشواری یہ ہے کہ زیادہ تر مسلم ممالک میں مالیاتی بازار (Financial market) ابھی اپنی ابتدائی شکل میں ہیں۔ وہ اتنی

ترقی یافتہ شکل میں نہیں ہیں کہ ان میں کھلے بازار کے اعمال کا استعمال پورے اعتماد کے ساتھ کیا جاسکے۔

ادارہ جاتی دشواریوں کے علی الرغم، مسلم ماہرین معاشیات نے متعدد ایسی تجاویز پیش کی ہیں جن کا استعمال غیر سودی بنیادوں پر کھلے بازار کے اعمال سرانجام دیے جانے کے لیے کیا جاسکتا ہے۔ ایسی ہی ایک تجویز ہے کہ مرکزی بینکوں کو تجارتی حصص رکھنے، خریدنے اور بیچنے کا مجاز کر دیا جائے۔ اگر مرکزی بینک معیشت میں زر کا پھیلاؤ چاہتا ہے تو وہ افراد، اداروں اور بینکوں سے تجارتی حصص خریدے گا۔ اس طرح بینک کے پاس مزید حصص جمع ہو جائیں گے اور معیشت کے زرِ نقد میں اضافہ ہوگا۔ اسی طرح اگر معیشت کے زر نقد میں تخفیف مقصود ہے تو مرکزی بینک حصص فروخت کرے گا، جو کہ افراد، ادارے اور تجارتی بینک خریدیں گے اور ان سے زر نقد مرکزی بینک کی طرف منتقل ہوگا۔ اس طرح معیشت میں زرِ نقد کی تخفیف عمل میں آئے گی۔ گو کہ اس تجویز کے مطابق حصص کی خرید و فروخت کے ذریعہ فراہمی نقد پر اثر انداز ہوا جاسکتا ہے، لیکن بعض دوسرے ماہرین معاشیات کا یہ بھی خیال ہے کہ اس طرح مرکزی بینک کے اعمال بازار حصص اور حصص کی قیمتوں پر بھی اثر انداز ہوں گے، جو ہوسکتا ہے کہ بیش تر حالتوں میں مقصود نہ ہو۔

گذشتہ برسوں میں اس تجویز کے علاوہ اس سلسلہ کی بعض دوسری تجاویز بھی سامنے آئی ہیں، مثلاً مضاربت بانڈ، مشارکت بانڈ، اجارہ بانڈ وغیرہ۔ یہ بانڈ بیع السلم کے اصول پر جاری کیے جائیں گے۔ ان میں سے بیش تر بانڈز غیر سودی ہوں گے۔ ان غیر سودی تمسکات کے پس پشت بنیادی خیال یہ ہے کہ یہ تمسکات کسی اصل اثاثے یا اس کے کسی جُز (Real asset) کی نمائندگی کریں گے اور کاملاً کسی مالی دعوے (Financial claim) کی خرید و فروخت پر مبنی نہیں ہوں گے۔ گو کہ ابھی یہ تجاویز صرف نظریاتی سطح پر ہیں، لیکن شاید ایک ایسا دن آئے گا جب مرکزی بینک ان تمسکات کو استعمال کر سکے گا۔

(ج) شرح بینک (Bank rate)

شرح بینک سے مراد سود کی اُس شرح سے ہے جس پر مرکزی بینک دوسرے

تجارتی بینکوں کو قرض دیتا ہے۔ اس طرح شرح بینک میں اتار چڑھاؤ کے ذریعہ مرکزی بینک اُس شرح کو بھی متاثر کرسکتا ہے جس پر عام تجارتی بینک، تاجروں اور عام آدمیوں کو قرض فراہم کرتے ہیں۔ اس شرح میں تبدیلی کے ذریعہ مرکزی بینک میں معاشرے میں رسدِ زر میں تبدیلی لاسکتا ہے۔

شرح سود پر اس کے انحصار کے باعث یہ طریقہ اسلامی معیشت کے لیے سودمند نہ ہوگا۔

(د) قرض کی راشننگ (Credit Rationing)

اس طریقے میں مرکزی بینک اہم تجارتی بینکوں کے لیے قرض دینے کی ایک حد مقرر کردیتا ہے۔ یہ حد عام طور پر بینک کے کُل سرمایہ، اور کُل جمع کی روشنی میں متعین کی جاتی ہے۔ اگر کوئی بینک اس حد کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کو اتنی ہی رقم مرکزی بینک کے کھاتے میں جمع کرانی ہوتی ہے جتنی رقم خلاف ورزی میں ملوث ہے۔ موجودہ نظام میں خلاف ورزی کرنے والوں کی شرح سود میں اضافہ کردیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام میں اس طریقے میں تبدیلی کی جاسکتی ہے، تاہم اس طریقے کو استعمال میں لائے جانے کا امکان موجود ہے۔

اسلامی معیشت میں روایتی طریقوں کی مناسبت

نمبر شمار	قرض پر کنٹرول کا ذریعہ	اسلامی معیشت کے لیے مناسبت
۱	حفاظتی تناسب	مناسب
۲	شرح بنک	غیر مناسب
۳	کھلے بازار کے اعمال	تبدیلی کے ساتھ مناسب
۴	قرض کی حدود کا تعیّن	مناسب
۵	قرض پر کنٹرول کے انتخابی طریقے	مناسب
۶	آخری امداد کا قرض مہیا کرنا	تبدیلی کے ساتھ مناسب
۷	ہدایات جاری کرنا	مناسب
۸	اخلاقی رہبری	مناسب

(ہ) قرض پر کنٹرول کے انتخابی طریقے (Selective Control)

اس طریقے کے ذریعہ مرکزی بینک قرض کی سمت (Direction of credit) کو متاثر کرتا ہے۔ بینک ترجیحی زروں کی ایک فہرست شائع کرتا ہے اور جو بینک ان کی ترجیح کے مطابق قرضے مہیا کر دیتے ہیں ان کو مختلف طرح کی سہولتیں اور امداد (Matching grant) دی جاتی ہیں۔ اس طریقے کو بھی اسلامی معیشت میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

(و) آخری امداد کا قرض مہیا کرانا (Lender of last resort)

اگر کوئی تجارتی بینک ادائیگی کی مشکلات میں پھنس جائے تو مرکزی بینک اس کو آخری امداد کے طور پر قرض فراہم کر کے اس کی مدد کرتا ہے۔ مناسب تبدیلی کے ساتھ یہ طریقہ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

(ز) ہدایات جاری کرنا

مرکزی بینک وقتاً فوقتاً تجارتی بینکوں کو مختلف قسم کی ہدایات جاری کرتا ہے۔ کوئی وجہ ایسی نظر نہیں آتی جس کی بنا پر اس طریقے کو اسلامی معیشت میں استعمال نہ کیا جاسکے۔

(ح) اخلاقی رہبری

اس طریقے کے تحت مرکزی بینک، تجارتی بینکوں سے غیر رسمی رابطے قائم کرتا ہے، اجتماعات منعقد کرتا ہے اور انھیں مختلف طرح کے مشورے دیتا ہے۔ ان اجتماعات میں بینک اپنے طریق کار اور پالیسیوں کی وضاحت کرتا ہے، کوئی بات مانع نہیں کہ یہ طریقے کیوں نہ جاری رکھے جائیں۔

ان طریقوں کے علاوہ بھی نئے طریقوں کا استعمال ممکن ہے۔ طوالت کے خوف سے ان طریقوں کی وضاحت یہاں نہیں کی جارہی ہے، تاہم ان نئے طریقوں سے قطع نظر مالی پالیسی کے روایتی طریقوں میں بھی اتنی لچک موجود ہے کہ ان کو غیر سودی نظام میں مفید طریقہ پر استعمال کیا جاسکے۔

تحریکِ آزادی میں فتاویٰ کا کردار

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

ہندوستان میں اسلام کے تعارف وفروغ کا سلسلہ ساتویں صدی عیسوی میں جنوبی علاقہ بالخصوص مالابار میں عرب تاجروں کے ذریعہ شروع ہوا۔ اس سرزمین پر مسلمانوں کی سب سے پہلی حکومت سندھ میں آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں قائم ہوئی۔ شمالی ہندوستان میں ان کی باقاعدہ حکومت تیرہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں دہلی سلطنت کے نام سے وجود میں آئی۔ سولھویں صدی عیسوی میں مغل بادشاہت قائم ہوئی جو دستوری طور پر ۱۸۵۷ء تک باقی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے حکومت کے قیام کے ابتدائی دور ہی سے اس ملک کو اپنا وطن سمجھا اور اس کی ترقی اور فلاح و بہبود کے کاموں کی انجام دہی کو اپنا فریضہ تصور کیا۔ اسی تصور کے تحت انھوں نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا اور اس کے حصول کے لیے اپنا وقت اور جان و مال سب کچھ قربان کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں علماء ہند کی خدمات نمایاں رہی ہیں۔ انھوں نے عملی جدوجہد کے علاوہ تقریر و تحریر کے ذریعہ تحریکِ آزادی کے کاز کو فروغ دینے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ ان کی ان خدمات میں مختلف مناسب مواقع پر فتاویٰ کا اجراء بھی شامل ہے، جن سے تحریک آزادی میں مسلمانوں کی سرگرمی کو تقویت پہنچی، اس کے پروگراموں کو عام مقبولیت حاصل ہوئی اور تحریک آزادی کو آزادی سے ہم کنار ہونے میں بڑی مدد ملی۔

اصل بحث سے قبل یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ کسی مفتی یا ماہر فقہ کی جانب سے ازخود یا کسی کے سوال کے جواب میں کسی مسئلہ پر شریعت کے نطقۂ نظر کی وضاحت فتویٰ کہلاتی ہے۔ فتویٰ دریافت کرنے والے کو مستفتی اور فتویٰ دینے والے کو

مفتی کہا جاتا ہے۔اس طرح مفتی کسی مسئلہ پر اپنی جو رائے ظاہر کرتا ہے وہی دراصل 'فتویٰ' ہے جس کی جمع 'فتاویٰ' ہے۔فتویٰ پوچھنے (استفتاء) اور فتویٰ دینے (افتاء) دونوں کے مقررہ اصول وضوابط ہیں۔ فتویٰ کی صحت کے لیے ان کا پاس ولحاظ ضروری ہے۔[۱] 'افتاء' فقہ اسلامی کا ایک اہم باب اور اسلام کے نظامِ قضا کا ایک ضروری جز ہے۔ پیش آمدہ مسائل میں عام مسلمانوں کی رہ نمائی کے علاوہ مفتی مقدمات کے فیصلہ میں قاضی کے مشیر ومعاون کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں۔مسلم معاشرہ میں کسی مسئلہ پر فتویٰ کو خاص اہمیت اس وجہ سے دی جاتی ہے کہ اس سے درپیش مسئلہ میں شریعت اسلامی کا موقف معلوم ہوتا ہے جو قرآنی آیات، احادیث نبوی ﷺ یا ان کی ترجمانی پر مبنی ہوتا ہے۔اسی لیے اس پر عمل کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں افتاء یا فتویٰ کے اجراء کا سلسلہ مسلم حکومت کے قیام کے اولین عہد سے شروع ہوا، اس لیے کہ کسی بھی مسلم معاشرہ میں شرعی نقطۂ نظر سے مسائل کی وضاحت اس کی اہم مذہبی ضروریات میں شامل ہوتی ہیں۔فتاویٰ کے مجموعوں کی ترتیب وتدوین بھی مسلم حکومت کے پہلے دور یعنی عہدِ سلطنت میں شروع ہوئی جو مغل دور میں مزید سرگرمی کے ساتھ جاری رہی۔[۲] اس ملک میں مسلم حکومت کے خاتمہ کے بعد بھی علماء مختلف مسائل پر شرعی نقطۂ نظر واضح کرتے رہے، جن میں برطانوی عہد میں ہندوستان کی شرعی حیثیت اور تحریکِ آزادی کے اہم پروگراموں سے متعلق فقہی رائے کا اظہار یا فتویٰ کا اجراء شامل تھا۔ یہ فتاویٰ انگریزوں کے خلاف جدّ وجہد کے لیے ذہن سازی کرنے اور تحریکِ آزادی کے مختلف مراحل میں پورے جوش وخروش کے ساتھ شرکت کے لیے فضا ہموار کرنے میں کافی معاون ثابت ہوئے۔

ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (۱۷۴۶-۱۸۲۴ء) کا فتویٰ (جاری شدہ ۱۸۰۳ء) بنیادی اہمیت رکھتا ہے، اس لیے کہ انھوں نے اپنے عہد کے ہندوستان کو 'دارالحرب' قرار دے کر خاص طور سے مسلمانوں میں یہ تحریک پیدا کی کہ وہ اس صورت حال میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے انگریزوں کے خلاف جدّ و جہد کریں۔ اس استفتاء (سوال) کے جواب میں کہ انگریزوں یا دوسرے

غیر مسلموں کے قبضہ یا کنٹرول (عمل داری) میں ملک کا جو حصہ ہے وہ دارالحرب ہے یا نہیں؟ شاہ عبدالعزیزؒ پہلے یہ واضح کرتے ہیں کہ دارالاسلام کب دارالحرب ہوجاتا ہے؟ پھر آخر میں علماء کی جس جماعت کے موقف سے وہ اتفاق کرتے ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''علماء کی ایک تیسری جماعت بھی ہے اور اس نے اس سے بھی ترقی کی ہے اور یہ کہا ہے کہ دارالحرب اس کو کہتے ہیں کہ وہاں نہ کوئی مسلمان اور نہ کوئی کافر ذمی امن سے سابق پناہ کے ذریعہ ہووے، خواہ بعض شعائر اسلام وہاں ترک کردے گئے ہوں یا نہ ترک کیے گئے ہیں اور خواہ باعلان شعائر کفر نے وہاں رواج پایا ہو یا نہ رواج پایا ہو اور اسی قول ثالث کو محققین نے ترجیح دی ہے اور باعتبار اس قول ثالث کے عمل داری میں انگریزی کی اور ان کے مانند اور دوسرے غیر اسلام کی عمل داری بلاشبہ دارالحرب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔''[۳]

ایک دوسرے مقام پر خاص دہلی کے حوالہ سے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''دارالاسلام دارالحرب نہیں ہوسکتا جب تک تین امور پائے جاویں۔ وہاں مشرکین کے احکام جاری ہوجاویں اور وہ دارالاسلام دارالحرب سے مل جائے اور وہاں کوئی مسلمان باقی نہ رہے اور نہ وہاں کوئی ایسا کافر ذمی رہ جاوے جو پہلے مسلمانوں سے پناہ لے کر رہا ہو اور اب بھی اس کی پناہ سے ہو... اس شہر میں مسلمانوں کے امام کا حکم ہرگز جاری نہیں ہے، نصاریٰ کے حکام کا حکم بے دغدغہ جاری ہے اور احکام کفر کے جاری ہونے سے یہ مراد ہے کہ مقدمات انتظام سلطنت و بندوبست رعایا و تحصیل خراج و باج و عشر اموال تجارت میں حکام بطورِ خود حاکم ہوں اور ڈاکوؤں اور چوروں کی سزا اور رعایا کے باہمی معاملات اور جرموں کی سزا کے مقدمات میں کفار کا حکم جاری ہو ... جب تک یہ اجازت نہ دیویں کوئی

مسلمان اور کافر ذمی ان اطراف میں نہیں آ سکتا۔ مصلحتاً واردین اور مسافرین اور تاجروں سے مخالفت نہیں کرتے اور اس شہر سے کلکتہ تک ہر جگہ نصاریٰ کا عمل ہے، البتہ داہنے بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنؤ اور رامپور میں ان کا حکم جاری نہیں، کیوں کہ ان مقامات کے والیان ملک نے ان سے صلح کر لی اور ان کی فرماں برداری منظور کر لی۔''[۴]

یہاں یہ وضاحت بے موقع نہ ہوگی کہ اہل علم کے ایک طبقہ میں یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت کے خلاف اصلاً شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) کی تحریروں سے فضا ہموار ہوئی۔ گرچہ انھوں نے باقاعدہ یہ فتویٰ جاری نہیں کیا کہ ہندوستان 'دارالحرب' ہے اور وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے، اس لیے کہ ان کے عہد (اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف اول) میں مغل بادشاہت انتشار، کم زوری وعدم استحکام کا شکار ضرور ہوگئی تھی، تاہم ابھی ان کی سیاسی بالادستی قایم تھی اور دہلی پر انگریزوں کا تسلط نہیں تھا، لیکن ان کی تحریروں بالخصوص امیر الامراء نجیب الدولہ اور شاہ احمد ابدالی (۱۷۲۴-۱۷۷۳ء) کے نام ان کے خطوط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھیں ملک میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات اور ان کے عواقب کا احساس تھا۔ اس خطرہ سے نپٹنے کے لیے بہ ظاہر ان کے ذہن میں جو پروگرام تھا اس میں اول مرہٹوں و جاٹوں پھر سکھوں سے مقابلہ اور ان کا استیصال اور آخر میں انگریزوں سے نبرد آزمائی اور ایک پرامن اسلامی ریاست کا قیام تھا۔[۵] یہاں یہ واضح رہے کہ نواب عبداللہ خاں کے نام خط میں شاہ صاحب نے بعض علاقوں کو، جہاں جاٹوں کا غلبہ تھا، واضح طور پر 'دارالکفر' قرار دیا تھا اور انھیں وہاں سے نقل مکانی کی نصیحت کی تھی۔[۶] اسی ضمن میں یہ ذکر بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شاہ ولی اللہؒ نے 'فیوض الحرمین' میں مکہ مکرمہ میں (۲۱ ذی قعدہ ۱۱۴۴ھ/ اپریل ۱۷۳۲ء کی شب میں) ایک خواب دیکھنے کا ذکر کیا ہے جس میں انھیں یہ دکھایا گیا کہ کفار کا سردار مسلمانوں کے شہروں پر غالب آ گیا ہے اور انھیں غارت گری اور قید و بند کا شکار بنا دیا ہے، اجمیر جیسے شہر میں اسلامی احکام کے بجائے احکامِ کفر جاری ہیں۔ اس صورت حال میں اللہ تعالیٰ کے غضب کو

محسوس کر کے وہ خود غصہ سے بھر جاتے ہیں جس کا اثر آس پاس میں جمع ہجوم پر بھی ہوتا ہے اور وہ پوچھتے ہیں کہ اللہ کی رضا کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ تمام نظام کو توڑ کر (فک کل نظام) ۔ پھر وہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کا ہجوم ان کی سربراہی میں ایک شہر سے دوسرے شہر جا کر غلبہ حاصل کرتا جا رہا ہے، یہاں تک اجمیر پہنچ کر کفار کے سردار کو تہِ تیغ کر ڈالا۔ اس طرح ان کے توسط سے سیاسی انقلاب برپا ہوا اور وہ مسلمانوں کے امام قرار پائے۔ ۷ بہ قول مولانا فیصل احمد بھٹکلی ''یہ کتنا کھلا خواب ہے، مستقبل کے کتنے انقلابات اس میں صاف دکھایے گئے ہیں... مستقبل قریب کے لحاظ سے دیکھیں تو یہ مرہٹوں پر پوری طرح صادق آتا ہے اور اگر مستقبل بعید تک اس کو وسعت دی جائے تو انگریزوں پر فٹ ہوتا ہے''۔ ۸ بہر حال نجیب الدولہ کے نام شاہ صاحب کے خط سے ان کے مرتّبہ پروگرام کی بابت واضح اشارے ملتے ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''تا وقتیکہ استیصال ایں سہ فرقہ نمی شود بادشاہے مطمئن شدہ می نشیند، نہ امراء و نہ رعیت بفراغ خاطر می تواند زیست، مصلحت دینی و دنیوی ہر دو دراں منحصر است کہ بعد فتح مرہٹہ بیدرنگ متوجہ قلعہ جات جت شوند و آنرا بہ نیروے برکات غیبیہ میسر فتح نمایند۔ بعد ازاں نوبت سکھ است آنجماعہ را نیز زیر و زبر باید ساخت و منتظر نفحات الٰہیہ باید بود''۔ ۹
>
> (جب تک ان تینوں فرقوں کا استیصال نہ ہوگا نہ کوئی بادشاہ مطمئن ہو کر بیٹھے گا، نہ امراء چین سے بیٹھیں گے اور نہ رعیت خاطر جمعی سے زندگی بسر کر سکے گی۔ دین و دنیا کی مصلحت اسی میں ہے کہ مرہٹوں سے جنگ جیتنے کے بعد فوراً قلعہ جات جٹ کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اس مہم کو بھی برکات غیبیہ کی مدد سے آسانی کے ساتھ سر کر لیں۔ اس کے بعد نوبت سکھوں کی ہے اس جماعت کو بھی شکست دینی چاہیے اور رحمتِ الٰہی کا منتظر رہنا چاہیے)۔ ۱۰

گرچہ اس خط میں، یا دوسرے خطوط میں انگریزوں کے بارے میں اظہارِ خیال یا ان کے خلاف باقاعدہ جدّو جہد شروع کرنے کا ذکر نہیں ہے، لیکن شاہ صاحب

کے بعد مسلم زعماء وعلماء نے اسی ترتیب سے آگے بڑھ کر انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کا آغاز کیا۔ دوسرے یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ شاہ صاحب کی دعوت پر ہی شاہ ابدالی مرہٹوں سے مقابلہ کے لیے ہندوستان آئے تھے، پھر ۱۷۶۲ء میں انہی کی زندگی میں سکھوں سے مقابلہ کیا۔ اپنی مہم کو آگے بڑھاتے ہوئے ۱۷۶۷ء میں آٹھویں حملہ کے دوران انگریزوں (جو اس وقت بنگال پر قبضہ جما چکے تھے) سے مقابلہ کے لیے فوج کا ایک دستہ الٰہ آباد روانہ کیا، تاکہ اودھ میں ان سے مقابلہ کیا جائے۔ گرچہ ہندوستان میں قیام کے دوران شاہ احمد ابدالی اور شاہ ولی اللہ کے مابین ملاقاتوں کی تفصیلات سے مآخذ خاموش ہیں، لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ شاہ صاحب نے ان کو اپنا پورا پروگرام سمجھا دیا ہو۔[۱۱] اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں شاہ صاحب کا جو نقطۂ نظر تھا اس سے متعلق مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی یہ رائے بہت متوازن معلوم ہوتی ہے:

> ''گرچہ ہماری نظر سے کہیں نہیں گزرا کہ شاہ صاحب نے ملک کو دارالحرب کہا ہو، لیکن وہ ملک کا جو نقشہ کھینچتے اور اس کے جو حالات بیان کرتے ہیں وہ ہرگز کسی دارالاسلام کے نہیں ہو سکتے اور اس بنا پر بلا تکلّف کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نیم شعوری ذہن میں ہندوستان کے دارالحرب میں منتقل ہو جانے کا تصور موجود تھا''۔[۱۲]

اس میں شبہ نہیں کہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے فتویٰ کو تاریخی حیثیت حاصل ہے اور تحریکِ آزادی کی تاریخ میں اسے بجا طور پر بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس فتوی کی ابتدا میں انھوں نے جس وضاحت کے ساتھ ہندوستان کے سیاسی حالات، مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی اختیارات اور ان کی سماجی صورت حال بیان کرنے کے بعد اس ملک کی شرعی حیثیت پر اپنی فقہی رائے ظاہر کی ہے اس کی نظیر اس نوعیت کے کسی دوسرے معاصر فتویٰ میں نہیں ملتی۔ درحقیقت یہ فتوی انگریزوں کے خلاف جدو جہد کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس فتویٰ کو علماء وعوام میں جو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی اس سے تحریکِ آزادی ہند کی بنیاد پڑی۔ اس فتویٰ سے ایک اور اہم نکتہ سامنے آتا ہے جس پر کم توجہ دی گئی اور وہ یہ کہ

شاہ صاحب نے دہلی پر انگریزوں کے غلبہ کے بعد فتویٰ جاری کرتے ہوئے اس کا جو پس منظر بیان کیا تھا اس میں انھوں نے صاف طور پر یہ لکھا تھا کہ اب (نصاریٰ کے اختیار کے تحت) مسلم یا ذمی (غیر مسلم) کوئی بھی اس امن (کی حالت) میں نہیں ہے جو انھیں پہلے (یعنی مسلم حکومت کے تحت) ملا ہوا تھا، دوسرے عام لوگ خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اس درجہ مجبور و بے بس ہو گئے ہیں کہ انگریزوں کی اجازت کے (یا ان سے پروانہ لیے) بغیر دہلی اور اس کے اطراف میں نہیں آ سکتے۔[١٣] (ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر و درنواح نمی تواند آمد) اس میں دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

١- مسلم حکومت کے تحت مسلم و غیر مسلم دونوں کو تحفّظ فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

٢- علماء ہند نے برطانوی تسلّط کے خلاف جو زوردار آواز اٹھائی اور اس سے نجات کے لیے جو جنگ چھیڑی اس سے مسلم و ہندو سب، بلکہ پورے ملک کا بھلا مقصود تھا۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی کے مذکورہ فتویٰ کے مشتملات پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے بجا فرمایا ہے:

> ''حضرت شاہ صاحب نے انگریزوں کے خلاف جو ظلم و ستم کی شکایت کی ہے اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا بھی ذکر کیا ہے، دونوں شہر دہلی میں امن کا پروانہ لیے بغیر نہیں آ سکتے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب انگریزوں کے مظالم سے صرف مسلمانوں کی نہیں، بلکہ ہندوؤں کی بھی گلوخلاصی چاہتے تھے''۔[١٤]

یہاں یہ ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا کہ شاہ ولی اللہ نے مغل حکم رانوں کو اپنے مخالفین کو زیر کرنے کے بعد حکومت کے نظم و نسق کو درست کرنے کے لیے جو نصیحتیں کیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ دہلی میں کسی کی جانب سے کسی مسلم یا غیر مسلم (ذمی) کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہونے پائے، یعنی مسلم و غیر مسلم دونوں کے تحفظ کا اہتمام ہو۔ نجیب الدولہ کو اسی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایں بار اگر می خواہند کہ کار دست بستہ میسر شود قدغن بلیغ باید نمود کہ کسی

باسلمانان وذمیان دہلی کار نداشتہ باشند‘‘ ۱۵؎

(اس بار اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ نظم ونسق درست ہوجائے تو پوری پوری تاکید کرنی چاہیے کہ دہلی کے مسلمانوں اور ذمیوں (غیر مسلموں) سے کوئی تعرض نہ کرے)

شاہ عبدالعزیزؒ کے فتویٰ کی اہمیت سے قطع نظر بعض جدید محققین کے خیال میں اس نوع کا سب سے پہلا فتویٰ شاہ ولی اللہ کے قریبی شاگرد اور شاہ عبدالعزیز کے رفیق قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۷۳۰-۱۸۱۰ء) نے جاری کیا، گرچہ وہ مشہور نہ ہوسکا۔ ’تحریک آزادی میں علماء کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے)‘ کے مصنف مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی نے اس فتویٰ کی اوّلیت کا احتمال ظاہر کیا ہے۔ ۱۶؎ جب کہ ممتاز عالم ومحقق مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی نے ان سے زیادہ واضح لفظوں میں اس فتویٰ کے مقدم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ خود ان کے الفاظ میں:

’’ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے دارالحرب ہونے کا برملا فتویٰ دینے میں حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب کو اولیت حاصل ہے۔ ہرچند کہ شہرۂ عام حضرت شاہ صاحب کے فتوی کو حاصل رہا‘‘۔ ۱۷؎

بہرحال ہندوستان کی شرعی حیثیت سے متعلق شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے جو فقہی موقف اختیار کیا، علماء وقت پر اس کے بڑے گہرے اثرات پڑے، متعدد علماء نے اس مسئلہ پر از سرنو غور وخوض کیا، ملک کے حالات اور مسلمانوں کو درپیش مسائل کی روشنی میں اپنی فقہی آراء متعین کیں اور اکثریت نے مذکورہ موقف سے اتفاق ظاہر کیا۔ جس کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف آواز زیادہ شدت سے بلند ہونے لگی۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں اس نوع کے فتاویٰ صادر کرنے والے ممتاز علماء میں شاہ رفیع الدین دہلوی (۱۷۴۹-۱۸۱۸ء)، مولانا عبدالحئی بڈھانوی (م ۱۸۲۸ء) مفتی الٰہی بخش (۱۷۴۹-۱۸۳۱ء)، شاہ اسمٰعیل شہید (۱۷۷۹-۱۸۳۱ء) اور سید احمد شہید (۱۷۸۷-۱۸۳۱ء) شامل ہیں۔ مشہور اردو مترجم قرآن شاہ رفیع الدین اپنے بھائی شاہ عبدالعزیز کے زیر تربیت رہے ہیں، انھوں نے دارالحرب کے شرائط و

لوازم سے متعلق فقہی توضیحات کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس ملک کے بارے میں معاصر علماء کی اختلافی آراء کا جائزہ لیا اور یہ واضح کیا کہ موجودہ صورت حال میں ہندوستان کا دارالحرب ہوجانا قول راجح ہے۔ خود انھوں نے بھی اسی رائے کو قابلِ ترجیح قرار دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہوگیا ہے، اس لیے کہ اس میں وہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں جو دارالاسلام کے دارالحرب ہونے کے لیے ضروری خیال کی جاتی ہیں (ایں ہمہ امور ایں جا موجود اند پس دارالحرب است) ۱۸؎۔ سید احمد شہیدؒ کی پوری تحریک جہاد اسی تصور پر مبنی تھی کہ ہندوستان پر غیر مسلموں کے قبضہ کے بعد اب اس کے دارالحرب ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا ہے اس لیے اس صورت حال میں تبدیلی کے لیے اہل اسلام پر جہاد فرض ہوگیا ہے۔ 'صراط مستقیم' میں ۱۸۱۸ء کے واقعات کے ضمن میں یہ مذکور ہے کہ انھوں نے جہاد کے ظاہری و باطنی فوائد و برکات بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اس وقت ملک کا اکثر حصہ دارالحرب ہوگیا ہے۔ ۱۹؎ اس کے علاوہ سید صاحب نے اپنے مکاتیب میں جابجا اس مسئلہ پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ مثلاً شاہ بخارا کے نام خط میں لکھتے ہیں:

> ''کفار فرنگ کہ بر سر ہندوستان تسلط یافتہ اند نہایت تجربہ کار، ہوشیار و حیلہ باز و مکار اند اگر بر سر اہل خراسان بیایند بہ سہولت تمام جمیع بلاد آنہا را بدست آرند۔ باز حکومت آنہا بولایت آنجناب (یعنی بخارا) متصل گردد و اطراف دارالحرب بہ اطراف دارالاسلام متحد شود''۔
>
> (جو فرنگی ہندوستان پر قابض ہوئے ہیں وہ بے حد تجربہ کار، ہوشیار، حیلہ باز اور مکار ہیں۔ اگر اہل خراسان (افغانستان) پر چڑھائی کردیں تو سہولت کے ساتھ ان کے ملک پر قابض ہوجائیں گے۔ پھر ان کی حکومت کی حدیں آپ کی حکومت سے مل جائیں گی۔ دارالحرب اور دارالاسلام کی سرحدیں مل جائیں گی) ۲۰؎

شاہ محمد اسمٰعیل شہید، مولانا عبدالحئ بڈھانوی اور مفتی الٰہی بخش تینوں سید احمد شہید کے تربیت یافتہ اور ان کے قریبی مریدین میں سے تھے۔ وہ ہندوستان کی شرعی حیثیت کے بارے میں نہ صرف یہ کہ ان کے موقف سے پوری طرح متفق تھے، بلکہ

انھوں نے اپنے طور پر بھی ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر کیا تھا اور یہ واضح کیا تھا کہ مسلمانوں پر جہاد کے فرض ہونے میں اب کوئی شبہ نہیں رہ گیا ہے۔۲۱

مولانا عبدالحئی بڈھانوی (جو شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے داماد تھے) نے تو بہت واضح لفظوں میں یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ انگیزوں کے تسلّط کے بعد اب ان کے خلاف جہاد فرض کفایہ نہیں، بلکہ فرض عین ہوگیا ہے۔ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''شہرے از اہل اسلام بدست کفار افتاد و آنہا حکمرانی کنند، پس بذمہ ہم مسلمین فرض است کہ سعی در دفع کفار از اں شہر بعمل آرند و ایں صورت در اکثر بلاد ہندوستاں پدیدار شدہ چنانچہ پوشیدہ نیست۔ پس بر ہمہ مسلمین مقابلہ فرض است''

(مسلمانوں کے کسی شہر پر کفار کا قبضہ ہوجائے اور وہ وہاں حکم رانی کرنے لگیں تو تمام مسلمانوں پر فرض ہوجاتا ہے کہ اس شہر سے کفار کا تسلط ختم کرنے کی سعی کریں۔ ہندوستان کے اکثر علاقوں میں یہ صورت پیش آچکی ہے جو مخفی نہیں ہے۔ پس تمام مسلمانوں پر اس کا مقابلہ فرض ہے)۔۲۲

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ 'تحریک آزادی میں علماء کا کردار' کے مصنف گرامی نے یہ ذکر کیا ہے کہ مفتی الٰہی بخش نے بھی ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا اور یہ کہ انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں یہ فتویٰ محفوظ ہے، لیکن انڈیا آفس لائبریری کے کیٹلاگ میں ان کے محولہ اندراج نمبر کے تحت پٹنہ کے مولانا الٰہی بخش کے فتویٰ (بغیر عدم صراحت خاص مضمون) کا ذکر ہے۔ البتہ کیٹلاگ میں اس فتویٰ کے ذکر سے پہلے کاندھلہ کے مولانا الٰہی بخش کی ایک کتاب (موسوم بہ بکٹ کہانی) کے بارے میں معلومات مندرج ہیں۔۲۳

اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت پر علماء ہند کی رائیں یا اس مسئلہ پر ان کے باقاعدہ فتوے انیسویں صدی کی ابتدا سے منظرعام پر آنا شروع ہوگئے تھے اور تحریک آزادیِ ہند منظّم انداز میں بعد میں شروع ہوئی جو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی پر منتج ہوئی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ملک کی شرعی حیثیت کے مسئلہ پر

علماء کو متوجہ کرنے، ان کے توسط سے مسلم عوام کو اس کے سلسلہ میں بیدار کرنے اور انگریزوں کے خلاف ان میں تحریک پیدا کرنے میں اِن فتاویٰ کا بہت اہم رول رہا ہے۔ ان فتاویٰ کے پس منظر کے بارے میں پڑھ کر یا سن کر انھیں اپنی سماجی و سیاسی حیثیت (بالخصوص غلامی و محکومی) کا احساس ہوا اور وہ اس یقین تک پہنچ گئے کہ موجودہ صورت حال کی تبدیلی کے لیے جدّ و جہد کرنا ان کا مذہبی فریضہ ہو گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان فتاویٰ میں ملک کی شرعی حیثیت، محض ایک قانونی اظہار و اعلان کی نہیں تھی، بلکہ ان میں آزادی کی باقاعدہ جدّ و جہد شروع کرنے کے لیے زبردست ترغیب و تحریک بھی تھی۔ یہ امر بدیہی ہے کہ کسی مشکل و اہم کام کے لیے لوگوں کا ذہن تیّار کرنے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور علماء ہند کے فتاویٰ نے یقینی طور پر یہ اہم اور کٹھن کام انجام دیا۔ ان فتاویٰ سے نہ صرف یہ کہ تحریکِ آزادی کی نشو و نما کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ علماء اس تحریک میں پیش پیش رہے ہیں اور یہ کہ ان کے فتاویٰ اس باب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اہم بات یہ کہ انگریز بھی اس کا اعتراف کرتے تھے۔ انھیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ علماء کے فتاویٰ عوام پر بہت گہرا اثر رکھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ باعثِ تشویش تھا کہ جیسے جیسے اِس ملک میں ان کا سیاسی اثر و رسوخ بڑھ رہا ہے اور یہاں کے حالات میں تبدیلی آ رہی ہے، لوگ علماء سے رجوع کر رہے ہیں اور اس ملک کی شرعی حیثیت سے متعلق ان کی رائے معلوم کر رہے ہیں اور ہم سے تعلقات و معاملات کے بارے میں ان سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بات بھی دردِ سر بن گئی تھی کہ بعض ممتاز علماء بالخصوص شاہ عبدالعزیز دہلوی اور مولانا عبدالحئ بڈھانوی نے اس ملک کو دارالحرب قرار دے کر اپنا موقف واضح کر دیا ہے۔ وہ یہ بھی شکوہ کرتے تھے کہ جیسے جیسے ہمارا اقتدار وسیع و مضبوط ہوتا جا رہا ہے اس باب میں علماء کے فتوی اور واضح انداز میں سامنے آتے جا رہے ہیں اور ہمارے خلاف مسلمانوں کے جوش و جذبہ میں اور اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان حقائق کی تصویر کشی خود ایک معروف انگریز مصنف ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر (W.W. Hunter) نے اپنی مشہور کتاب (THE INDIAN MUSALMANS)

میں کی ہے۔اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"As we gradually transferred the administration to our own hands, Pious Musalmans greaetly agitated touching the relation which they should hold to us. They accordingly consulted the highest Indian authorities on the point and both the celebrated men mentioned above (Shah Abdul Aziz and Maulana Abdul Hai) gave forth response ..... When we consolidated our power, the decisions of the Doctors became more and more distinct as to India being *Dar al Harb* . these Decisions have practical fruit, The wahabis, whose zeal is greater than their knowledge, deduce from, The fact of India being technically a country of enemy, the obligation to wage war upon its rulers." ۲۴

علماء کے فتاویٰ کی اہمیت اور اس کے اثرات کے بارے میں دیگر انگریز مصنفین کے بھی اس طرح کے بیانات کتابوں میں ملتے ہیں۔

یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات، مسلمانوں کے مذہبی وسماجی وسیاسی حقوق تلف ہونے کے پیش نظر شاہ عبدالعزیز نے اس ملک کے دارالحرب ہونے کا جو فتویٰ دیا تھا بعد کے دور (جب کہ یہ ملک پوری طرح ان کی گرفت میں آ گیا تھا) کے علماء اس فتویٰ کی تصدیق کرتے رہے، یا اس کی حمایت میں اپنے فتاویٰ جاری کرتے رہے، تاکہ ملک پر برطانوی تسلّط کے خاتمہ اور اس کی آزادی کی جدّ و جہد کے لیے مسلمانوں کی سرگرمیاں اور تیز ہو جائیں اور وہ اس مقصد کے حصول کے لیے مزید جوش وخروش کے ساتھ اپنی قربانیاں جاری رکھیں۔اس ضمن میں خاص بات یہ کہ متاخر علماء بھی شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ کو بنیادی اہمیت دیتے رہے۔مثال کے طور پر شیخ

الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اپنے ایک مکتوب (بہ نام محمد صدیق، چاہ میراں، پنجاب) میں فرماتے ہیں:

''ہندوستان دارالحرب ہے۔ وہ اس وقت تک دارالحرب باقی رہے گا جب تک اس میں کفر کا غلبہ حاصل رہے گا۔ دارالحرب کی جس قدر تعریفات کی گئی ہیں اور جو شروط بیان کی گئیں ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے اپنے فتاویٰ میں اس موضوع پر بحثیں فرمائی ہیں۔ ان پر کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا''۔[۲۵]

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے والے فتاویٰ نے تحریکِ آزادی کی بنیاد ڈالنے اور پھر اسے مہمیز دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد بھی تحریک آزادی کے مختلف مراحل میں فتاویٰ جاری کیے گئے۔ ان میں وہ فتویٰ بڑی اہمیت کا حامل ہے جو جولائی ۱۸۵۷ء میں جامع مسجد دہلی میں مرتب کیا گیا اور ۳۳ یا ۳۴ علماء کے دستخط سے جاری ہوا۔ یہ تاریخی فتویٰ اس وقت ترتیب دیا گیا جب جنرل بخت خاں ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو دہلی پہنچے اور انگریزوں کے خلاف جدّ و جہد کو مزید منضبط کرنے اور آگے بڑھانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس وقت دہلی میں صورت حال کافی نازک تھی اور انگریزوں کا ظلم اور زیادتی کافی بڑھ گئی تھی۔ اس صورت حال میں اس فتویٰ کے ذریعہ جہاد کو فرض عین قرار دیا گیا۔ یہاں استفتاء و فتویٰ کا متن نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

(استفتاء)

''کیا فرماتے ہیں علماء دین اس امر میں۔ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں، اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں؟ اور وہ لوگ جو شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد چاہیے یا نہیں؟ بیان کرو، اللہ تمھیں اجر دے گا۔''

(جواب)

''درصورت مرقوم فرض عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے، اور استطاعت ضرور ہے اس فرضیت کے واسطے، چنانچہ اس شہر والوں کو طاقت مقابلے اور لڑائی کی ہے بسبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے والے آلات حرب کے، تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا اور اطراف وحوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر جائیں مقابلہ سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہوجائے گا اور اسی طرح اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہوجائے گا اور جو عدو بستیوں پر ہجوم اور غارت اور قتل کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض ہوجائے گا بشرط ان کی طاقت کے''۲۶

اس فتویٰ پر دستخط کرنے والوں میں یہ حضرات شامل تھے: مولوی نور جمال، محمد عبدالکریم، سید محمد نذیر حسین، سکندر علی، رحمت اللہ، مفتی صدرالدین، مفتی اکرام الدین، سید رحمت علی، محمد ضیاء الدین، عبدالقادر، احمد سعید، مولوی عبدالغنی، مولوی محمد علی، فریدالدین، محمد سرفراز علی، محبوب علی جعفری، الٰہی بخش، محمد حامی الدین، سید احمد علی، محمد کریم اللہ، مولوی سعیدالدین، محمد مصطفیٰ خاں، محمد انصار علی، محمد ہاشم، حفیظ اللہ خاں، محمد نورالحق، حیدر علی، سیف الرحمٰن، سید محمد، محمد امداد علی، سید عبدالحمید، مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی خاں اور قاضی القضاۃ محمد علی حسین۔۲۷

مشہور مجاہد آزادی مولانا فضل حق خیرآبادی (۱۷۹۷-۱۸۶۱ء) فتوی کے اجراء کے وقت (جولائی ۱۸۵۷ء) دہلی میں موجود نہیں تھے، وہ اگست میں یہاں پہنچے۔ بعض اہل قلم نے اس فتوی پر دستخط کرنے والوں میں ان کا نام غلط طور پر شامل کردیا ہے۔ البتہ ان کی بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس فتوی سے متفق تھے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے بیان کے مطابق ''ان کا ایک الگ مستقل فتویٰ جہاد تھا جس کا ذکر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی اسلامی تاریخوں میں تفصیل سے کیا گیا ہے''۔۲۸

اس کثیر دستخطی فتویٰ نے مسلم عوام پر کافی اثر ڈالا۔ انگریزوں کے خلاف جدّ و جہد میں مزید تیزی آئی اور تحریکِ آزادی کے متوالے جوش و خروش سے معمور ہوگئے۔ ہزاروں لوگ جنگ میں شرکت کے لیے دہلی میں جمع ہوگئے اور ان میں بہت سے ایسے سامنے آئے جو ملک کی آزادی کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے یا اس پہلی جنگ آزادی کے دوران جو فتاویٰ جاری کیے گئے، انگریزوں کے خلاف فضا گرم کرنے اور لوگوں کو جدّ و جہد آزادی کی راہ میں سرگرم کرنے میں ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس جنگ کے بعد وہ علماء خاص طور سے برطانوی حکومت کے عتاب اور انتقامی رویّہ کا نشانہ بنے جنھوں نے مذکورہ بالا فتاویٰ جاری کیے تھے، یا ان کی تائید کی تھی۔ سزائے موت، کالا پانی، پُر مشقت قید و بند جیسی اذیت ناک سزائیں ان کو دی گئیں۔

کسی بھی اہم مقصد کے حصول کے لیے ملک کے عوام کے مختلف طبقوں میں اشتراک و تعاون کے جذبہ کا فروغ پانا ضروری ہوتا ہے۔ تحریکِ آزادی کے دوران اس کی ضرورت محسوس کی گئی، بلکہ اسے ضروری سمجھا گیا کہ مسلمان اور ہندو مل کر اس تحریک کو آگے بڑھائیں اور باہمی اشتراک وتعاون سے اس اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے جدّ و جہد کریں اور سچ پوچھیے تو اہلِ ہند کے اسی جذبہ نے آزادی کی منزل تک پہنچنا آسان بنادیا۔ اُسی دوران علماء ہند نے اس مسئلہ پر فقہی نقطۂ نظر سے بھی غور وخوض کیا اور بعض نے اس سلسلہ میں واضح طور پر اپنی رائے ظاہر کی کہ سماجی و معاشی معاملات میں ہندوؤں کے ساتھ اشتراک و تعاون میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ اس کی وجہ سے شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ لازم آتی ہو۔[۲۹] اسی طرح شرعی طور پر اس بات کو بھی جائز قرار دیا گیا کہ بوقت ضرورت غیر مسلموں کا تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے۔[۳۰] سیاسی سطح پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا مسئلہ خاص طور سے ۱۸۸۵ء میں کانگریس پارٹی کے قیام کے بعد علماء کے مابین زیرِ بحث آیا۔ متعدد علماء نے فقہی نقطۂ نظر سے اس پر غور وفکر کرکے کانگریس میں شمولیت اور ہندو اور مسلم میں اشتراک و تعاون کے حق میں اور مسٹر

بیک کی قائم کردہ اور سرسید احمد کی حمایت کردہ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (Indian patriatic association) کے خلاف اپنی آراء ظاہر کیں۔ مولانا عبدالقادر لدھیانوی کے صاحبزادگان مولانا محمد، مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبداللہ نے ان فتاویٰ کو 'نصرۃ الابرار' کے نام سے مرتب کیا اور سو علماء کے دستخط کے ساتھ ۱۸۸۸ء میں شایع کرایا۔[۳۱] اس پر دستخط کرنے والوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن (۱۸۵۱-۱۹۲۰ء) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۸۲۹-۱۹۰۵ء) بھی شامل تھے۔[۳۲] یہ رسالہ بڑے پیمانہ پر عوام میں تقسیم کیا گیا۔ یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ ایک دفعہ ایک صاحب نے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی (۱۸۷۹-۱۹۵۷ء) سے کانگریس میں شمولیت کے جواز وعدم جواز کے بارے میں استفسار کیا تو جواب میں یہ واضح فرمایا کہ ''یہ جماعت بلا کسی تفریق اہل ہند کے فطری وملکی حقوق واپس دلانے کے لیے جدّ و جہد کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے اور ملک کو آزاد کرانا اس کا نصب العین ہے۔ مسلمان اس میں ابتدا ہی سے شریک رہے ہیں گویا اس میں شمولیت میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے اور پھر آخر میں 'نصرۃ الابرار' کا حوالہ دیا کہ اس کے مرتب نے اس رسالہ میں اس مسئلہ پر بہت سے علماء کے فتاویٰ جمع کردیے ہیں، مزید تفصیل کے لیے یہ رسالہ دیکھا جاسکتا ہے۔''[۳۳] بہرحال 'نصرۃ الابرار' میں شایع شدہ فتاویٰ ہندو مسلم اتحاد اور ملک کے مفاد میں باہمی تعاون کا جذبہ بڑھانے میں مفید وموثر ثابت ہوئے۔ ظاہر ہے کہ انگریز اس کو کبھی پسند نہیں کرسکتے تھے، اس لیے کہ یہ ان کی جابرانہ حکومت کے لیے خطرہ کی گھنٹی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کے اہل کار 'نصرۃ الابرار' کی کاپیاں جہاں پاتے ضبط کرلیتے تھے اور علماء اسے بار بار شایع کرا کے تقسیم کرتے رہتے تھے۔[۳۴] اس سے بھی حکومت کی نظر میں فتویٰ کی اہمیت اور عوام پر اس کے اثرات کا مزید ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

یہ بات معروف ہے کہ تحریکِ آزادی مختلف مراحل سے گزر کر کامیابی کی منزل تک پہنچی۔ ان مراحل میں تحریکِ ترک موالات (Non-Cooperation) نمک ستیہ گرہ اور خلافت تحریک بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے سلسلے میں علماء نے فتاویٰ

جاری کیے، یا اپنی فقہی آراء ظاہر کیں، جن سے بلاشبہ تحریک آزادی کو تائید وتقویت پہنچی۔ تحریکِ ترکِ موالات (یعنی حکومت کے ساتھ عدم تعاون یا اس کے مناصب، عہدوں اور خطابات سے دست بردار ہوجانے حکومت کی کونسلوں میں شرکت کو قبول نہ کرنے اور صرف ملکی مصنوعات استعمال کرنے) کی تحریک۔ ترکی میں حکومت برطانیہ کی مسلم مخالف پالیسی اور اہل ہند کے معاملے میں اس کے جابرانہ و غیر منصفانہ اقدامات کے خلاف تحریک جون ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی۔ خلافت کمیٹی اور کانگریس دونوں نے اسے اپنے پروگرام میں شامل کیا۔ اس ضمن میں برطانوی حکومت یا انگریزوں کے ساتھ تعاون کے عدم جواز پر شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا فتویٰ (تحریر کردہ ۳ ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ/ ۱۹ جولائی ۱۹۲۰ء) بہت مشہور ہے۔ 'الانور' کے مؤلف جناب عبدالرحمٰن کوندو کے بیان کے مطابق اس فتویٰ کا متن ممتاز محدث و معروف مجاہد آزادی مولانا انور شاہ کشمیری (۱۸۷۵-۱۹۳۳ء) نے شیخ الہند کی ہدایت پر تیار کیا تھا اور یہ کہ اس فتوی کا متن اتنا جامع و مانع تھا کہ شیخ الہند نے کافی پسند فرمایا۔[۳۵] اس فتوی کو اس وقت اور زیادہ شہرت ومقبولیت ملی جب جمعیۃ العلماء کے کلکتہ اجلاس (منعقدہ ۶ ستمبر ۱۹۲۰ء) میں سینکڑوں علماء نے اس کی توثیق کی اور ۴۷۴ علماء کے دستخط کے ساتھ اسے شایع کر کے ملک کے مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا۔[۳۶] اس طویل فتویٰ کا ضروری حصہ ملاحظہ ہو:

''مالٹا سے واپس آ کر مجھ کو معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ارباب بسط وکشاد نے آخری طریقِ کار اپنے فرض کی ادائیگی اور اپنے جذبات وحقوق کے تحفظ کا قرار دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کی صحیح اور ایک صریح تعلیم اور رسول اکرم ﷺ کے ایک روشن اسوہ حسنہ کو مضبوط تھام لیں اور نفع وضرر قومی کا موازنہ اور عواقب کی پوری جانچ کر کے اس کو بے خوف وخطر انجام تک پہنچائیں ... وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اعداء اسلام کے ساتھ تعاون و موالات کو اعتقاداً وعملاً ترک کر دیں۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت نا قابلِ انکار ہے اور ایک صادق مسلمان کی عزت کا ایسے

حالات میں یہی تقاضا ہونا چاہیے کہ وہ (۱) سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کردے (۲) ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کردے (۳) صرف اپنی ملکی اشیاء اور مصنوعات کو استعمال کرے (۴) سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے (۵) اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شایع کی جائیں ان پر عمل کرے، بشرطیکہ اتباعِ شریعت کیا جائے اور عمل درآمد میں خلافِ حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ کرے، نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد و نقضِ امن کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال مدِّنظر رہے اور ارشاد عثمانؓ "**اذا احسن الناس فاحسن معھم واذ اساؤا فاجتنب اساء تھم**" (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو اور جب برا کام کریں تو برائی سے بچتے رہو) کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید و ضروری سمجھا جائے۔ واللہ الموفق والمعین۔ العبد محمود حسن عفی عنہ دیوبندی -۳ ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ۔[۳۷]

ترکِ موالات سے متعلق اس فتویٰ کی اشاعت و تقسیم کے بعد انگریزوں کے خلاف ماحول اور گرم ہوگیا۔ اِس کے زیرِ اثر بہت سے لوگوں نے حکومت کے عطا کردہ خطابات اور توصیفی اسناد واپس کردیے اور سرکاری ملازمتیں تیاگ دیں۔ خطابات واپس کرنے والوں میں جامع مسجد دہلی کے امام مولانا سید احمد بھی شامل تھے، جنھیں حکومت سے 'شمس العلماء' کا خطاب ملا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں اس طرح کے فتویٰ کو جو اہمیت دی جاتی تھی اس کا کچھ اندازہ سید احمد کے اس خط سے لگایا جاسکتا ہے۔ جسے 'شمس العلماء' کا خطاب واپس کرتے ہوئے انھوں نے چیف کمشنر دہلی کو لکھا تھا۔ خطاب کی واپسی کی وجہ ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے تحریر کیا تھا کہ علماء کے فتویٰ کی رو سے سرکاری اعزازات و خطابات کی قبولیت ناجائز ہوگئی ہے اور وہ اس فتویٰ کی خلاف ورزی نہیں کرسکتے۔ اس لیے کہ اسلامی قانون کے مطابق اس کی پابندی ضروری ہوگئی ہے۔ اس خط کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

''میرے پاس شہر کے سربرآوردہ اور معزز افراد کا ایک وفد، جس میں ہر طبقہ کے خیال کے لوگوں کے علاوہ علماء کرام پر مشتمل تھا، کل میرے پاس آیا۔ انھوں نے ایک فتویٰ بھی پیش کیا۔ وہ خطاب کی واپسی سے متعلق تھا۔ اسلامی قانون کے تحت مسلم عوام کو فتویٰ کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ میں اس فتویٰ کی وجہ سے کسی طرح انکار نہ کرسکا۔ اس فتویٰ کی حکم عدولی میرے لیے ممکن نہیں تھی۔ اس لیے اپنی قوم کے مطالبہ پر اپنا شمس العلماء کا خطاب، سند اور تحفہ واپس کرتا ہوں۔ (مورخہ ۳۰/اپریل ۱۹۲۰ء)''[۳۸]

بہرحال اس فتویٰ کے بڑھتے ہوئے اثرات محسوس کر کے حکومت نے اس کی ضبطی کے احکام جاری کیے اور اس پر دستخط کرنے والوں اور اس کی تائید و توثیق کرنے والوں کے خلاف کارروائی شروع ہوئی۔ مختلف مقامات سے بہت سے علماء کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا، جس کے نتیجہ میں وہ قید و بند کی سزا سے دوچار ہوئے۔[۳۹] بلاشبہ یہ فتویٰ بھی عوام میں تحریکِ آزادی کے معاملے میں بیداری پیدا کرنے اور اس کے کاز کو آگے بڑھانے میں مفید و معاون ثابت ہوا۔ اس پر یہ امر بھی شاہد ہے کہ خلافت کمیٹی اور آزادی کی جدّ و جہد میں مصروف دوسری تنظیموں نے اسے خاص اہمیت دی اور عوام میں اس کی تشہیر کو اپنے پروگرام کا حصہ بنایا۔

تحریکِ خلافت اور تحریکِ آزادی میں جو گہرا ربط و تعلق ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دونوں تحریکیں باہم مربوط تھیں اور ایک کو دوسرے سے تقویت ملی۔ خلافت کمیٹی مارچ ۱۹۱۹ء میں علماء ہند کے اس موقف پر قایم ہوئی تھی کہ قانونی طور پر 'سلطانِ ترکی' ہی مسلمانوں کے خلیفہ ہیں، اس لیے موجودہ صورت حال میں پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ ترکی خلافت کی بحالی کے لیے جدّ و جہد کریں۔ دراصل اس کمیٹی کے قیام میں بھی فتویٰ کا رول رہا ہے۔ فروری ۱۹۱۹ء میں انجمن مؤیّد الاسلام کی ایک میٹنگ (منعقدہ زیر صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی، بمقام فرنگی محل، لکھنؤ) میں یہ تجویز منظور کی گئی کہ ایک فتویٰ مرتب کیا

جائے جس میں منصب خلافت سے متعلق شریعت کے قوانین واضح کیے جائیں اور مختلف ملکوں کے علماء کے دستخط کے ساتھ اسے گورنر جنرل اور وزیرِ ہند (SECRETARY OF STATE) کو بھیجا جائے اور اس میں اس نکتہ پر خاص زور دیا جائے کہ خلافت سے متعلق انجمن مؤیّد الاسلام ہی کا موقف شریعت کے مطابق ہے، اس کے علاوہ کسی اور نقطۂ نظر کو شریعت کا نقطۂ نظر نہ سمجھا جائے۔[۴۰] علی برادران کی سربراہی میں خلافت کمیٹی نے باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی اور نہ صرف عالمِ اسلام بلکہ اس ملک میں بھی حکومتِ برطانیہ کے مستبدانہ و غیر منصفانہ اقدامات کے خلاف احتجاج اور ان کی روک تھام کے لیے یہ ایک مضبوط آواز بن گئی۔ خلافت کمیٹی کی سرگرمیوں سے تحریکِ آزادی کو بڑی قوت و مقبولیت ملی۔ اس لیے کہ دونوں کا مطمحِ نظر برطانوی حکومت کے خلاف جدّ و جہد اور اس کے ناروا اقدامات سے نجات حاصل کرنا تھا۔ مہاتما گاندھی اور تحریک آزادی کے دوسرے رہنماؤں نے پوری طرح اس کی حمایت کی اور اس کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں مدد دی۔ دوسری جانب خلافت کمیٹی نے تحریکِ آزادی کے مختلف پروگراموں میں تعاون دینے کے علاوہ ترکِ موالات سے متعلق مذکورہ فتویٰ کو خوب مشتہر کیا۔ ان سب سے اہم یہ کہ خلافت کانفرنس کے کراچی اجلاس (منعقدہ زیرِ صدارت مولانا محمد علی جوہر بتاریخ ۱۹ ستمبر ۱۹۲۱ء) میں اس فتوی کی حمایت میں ایک ریزولوشن منظور کیا گیا۔ اس کے تحت مسلمانوں کے لیے برطانوی حکومت کی پولس و فوج میں ملازمت کو ناجائز قرار دیا گیا۔ بعد میں اسے باقاعدہ ایک فتویٰ کی صورت میں مرتب کر کے علی برادران، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا نثار احمد اور پیر غلام مجید کے دستخط کے ساتھ شایع کیا گیا۔ خلافت کمیٹی نے ملک کے مختلف حصوں میں اس کی تقسیم کا اہتمام کیا۔[۴۱] حکومت نے کانفرنس کے اس ریزولوشن کا سخت نوٹس لیا جس میں فتویٰ کی بنیاد پر مسلم سپاہیوں سے فوجی خدمت چھوڑنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ حکومت نے علی برادران اور اجلاس کے اہم شرکاء کے خلاف بغاوت پھیلانے کا مقدمہ قایم کیا جو کراچی مقدمہ کے نام سے مشہور ہے۔ نتیجہ کے طور پر انھیں قیدِ با مشقت کی سزا جھلینی پڑی۔[۴۲] اِن جابرانہ و منتقمانہ اقدامات سے فتویٰ کا پیغام اور عام ہوا، تحریکِ آزادی کی لئے مزید بڑھی اور منزلِ مقصود کی طلب میں اہل ہند کے حوصلے اور بلند ہوئے۔

نمک ستیہ گرہ، جسے گاندھی جی نے ۱۹۳۰ء میں حکومت کے عوام مخالف نمک قانون کے خلاف شروع کیا تھا، تحریک آزادی کا بہت ہی اہم موڑ ثابت ہوا۔ غیر ملکی حکومت کی جابرانہ پالیسیوں کے سلسلہ میں عوام میں اس سے زبردست بیداری پیدا ہوئی۔ اس نے جدّ و جہد آزادی کی آواز کو گھر گھر پہنچادیا۔ اس نئے قانون کی رو سے نمک پر ٹیکس عاید کیا گیا اور ہندوستانیوں کے لیے نمک بنانا اور فروخت کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ اس طرح نمک سازی اور اس کے کاروبار پر حکومت کی اجارہ داری قائم ہوگئی۔ اس کی وجہ سے نمک کافی مہنگا ہوگیا۔ نتیجہ کے طور پر غریب لوگوں کے لیے کھانے کو لذیذ بنانے کا ادنیٰ سامان میسّر ہونا مشکل ہوگیا۔ اسی نامناسب اور استبدادی قانون کے خلاف گاندھی جی نے تحریک شروع کی۔ اس میں مسلمانوں نے بھی پورے جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا۔ علماء نے اپنی تقریروں وتحریروں کے ذریعہ اس تاریخی ستیہ گرہ کی نسبت عام مسلمانوں میں بیداری پیدا کی ۴۳؎ اور بعض نے اس قانون کے خلاف اپنی فقہی رائے ظاہر کی۔ نامور محدث مولانا انور شاہ کشمیری اس وقت جامعہ اسلامیہ (ڈابھیل، گجرات) میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھوں اس قانون کی علانیہ مخالفت کی اور یہ فرمایا کہ ''مذہب اسلام میں نمک مباح الاصل ہے، جیسے ہوا، پانی اور خودرو گھاس''۔ گویا اسلام کے رو سے نمک جیسی عام استعمال کی چیز پر پابندی لگانا یا محصول عائد کرنا صحیح نہیں ہے۔'' ۴۴؎ بقول سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب ''شاہ صاحب کے اس اعلانِ حق کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کے عام طبقہ کو نمک کی تحریک سے ہمدردی ہوگئی''۔ ۴۵؎

مزید براں وہ کہتے تھے کہ ''ہمیں یقین ہوگیا ہے کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے گا، کیونکہ اس نے قدرتی اشیاء پر بھی ٹیکس عائد کردیا ہے، ہوا پر ٹیکس، فضا پر ٹیکس، نمک پر ٹیکس، جن چیزوں کو قدرت نے آزاد رکھا تھا ان پر پابندی عائد کرنا قدرت کا مقابلہ ہے جس کے بعد زیادہ روز تک بقا نہیں ہوسکتی''۔ ۴۶؎ مشہور فقیہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (۱۹۰۲-۱۹۸۴ء) نے یہ رائے پیش کی کہ کسی حکومت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ پانی ونمک جیسی عام استعمال کی چیزوں پر ٹیکس لگائے اور اگر کوئی حکومت ایسا کرتی ہے تو اس کے خلاف جدّ و جہد کرنا، اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا ضروری ہے۔ ۴۷؎

یہاں یہ ذکر بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نمک ستیہ گرہ کے دوران جب گاندھی جی سوراشٹر میں مقیم تھے تو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (۱۹۰۱-۱۹۷۲ء) اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی گاندھی جی سے ملاقات کے لیے گئے اور ان دونوں حضرات نے نمک ستیہ گرہ کی حمایت کرتے ہوئے اس کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ اسی ملاقات کے دوران گاندھی جی نے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سے دریافت کیا کہ سنا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی کوئی ایسی حدیث ہے کہ نمک، پانی اور گھاس رفاہ عام کی چیزیں ہیں، اس لیے ان پر محصول عائد کرنا صحیح نہیں۔ مولانا نے اس کی تصدیق فرمائی اور جب حدیث کا متن ۴۸ اردو ترجمہ کے ساتھ گاندھی جی کی خدمت میں پیش کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ۴۹ اس طرح علماء ہند نے اس مسئلہ پر اپنی رائے ظاہر کر کے نمک ستیہ گرہ کو عوامی تحریک بنانے میں مدد بہم پہونچائی، جس سے بلاشبہ آزادئ ہند کی راہیں مزید ہموار ہوئیں۔

اوپر کے مباحث سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ تحریکِ آزادی میں علماء کے کردار کا ایک اہم حصہ اس کے مختلف مراحل میں اہم پروگراموں سے متعلق اپنی فقہی رائے ظاہر کرنا، یا فتاویٰ جاری کرنا تھا۔ ان سے اِن پروگراموں میں مسلم عوام کی دلچسپی اور سرگرمی میں اضافہ ہوا اور ملک کی آزادی کی جدّ و جہد میں ان کا جوش وخروش اور بڑھ گیا۔ تحریکِ آزادی کی راہ میں ان فتاویٰ کی اہمیت یہی تھی کہ انھوں نے برطانوی حکومت کے جابرانہ، مستبدّانہ اور غیر منصفانہ اقدامات کے خلاف عام مسلمانوں کے شعور واحساس کو بیدار کیا اور اس حکومت کے خاتمہ کے لیے ان کی جدّ و جہد کو اور تیز کیا۔ ان فتاویٰ کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے تحریکِ آزادی کے دوران مختلف تنظیموں اور جماعتوں نے عوام میں ان کی عام اشاعت کو اپنے پروگرام کا اہم جز بنایا۔ دوسری جانب مجاہدینِ آزادی پر ان کے گہرے اثرات کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ تحریکِ آزادی کو کچلنے کے لیے دوسرے اقدامات کے ساتھ حکومت ان فتاویٰ کو ضبط کرتی رہی، ان کی اشاعت کو روکتی رہی اور ان کا اجراء اور تصدیق کرنے والوں کے خلاف سخت کار روائیاں بھی کرتی رہی۔ ان فتاویٰ کے سلسلہ میں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان سے ہندو مسلم اتحاد کو تقویت ملی اور ملک کی بھلائی و بہبودی کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا جذبہ

پروان چڑھا۔ آخر میں اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ آزادی کے دوران میں جاری یا مرتب کیے گئے مذکورہ بالا فتاویٰ اس دور کے متعلقہ فتاویٰ لٹریچر کے محض کچھ اجزاء تھے۔ فتاویٰ کے مجموعوں، دارالافتاء کے ریکارڈ اور پرائیویٹ ذخائرِ کتب میں اس نوع کے بہت سے فتاویٰ منتشر و غیر مستعمل صورت میں محفوظ پڑے ہیں۔ انھیں تلاش کرنا، مرتب کرنا اور ان کا تجزیاتی مطالعہ کرنا اس لحاظ سے بھی مفید ہوگا کہ تحریکِ آزادی سے متعلق لٹریچر کا ایک اہم ذخیرہ سامنے آجائے گا اور اس سے اس تحریک کی تاریخ کے کچھ نئے گوشے واضح ہوں گے۔ اللہ کرے ہمیں اس کے ذریعہ علم فقہ و فتاویٰ اور اپنے وطن کی خدمت کی توفیق نصیب ہو۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

حواشی ومراجع

۱۔ فتوی کے اصول و آداب پر تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: غلام یوسف، فتوی کی ضرورت واہمیت، آداب وشرائط، فکر ونظر (اسلام آباد)، اپریل-جون ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۵-۱۵۸:
Encyclopedia of Islam (Article on *Fatwa*), E.J. Brill, Leiden, 1960,/866-867

۲۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: Zafarul Islam, *Fatawa literature of the Sultanate Period,* Karishka Publishers, New Delhi, 2005, pp,18-36

۳۔ سرور عزیزی (اردو ترجمہ فتاویٰ عزیزی از شاہ عبدالعزیز دہلوی)، مطبع مجیدی، کانپور (بدون تاریخ)، ۱/۲۰۶-۲۰۷

۴۔ سرور عزیزی، محولہ بالا، ۱/۳۶

۵۔ فیصل احمد بھٹکلی ندوی، تحریک آزادی میں علماء کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے)، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۳ء، ص ۳۲-۳۳، ۱۵۸-۱۵۹

۶۔ خلیق احمد نظامی (مرتب)، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء، ص ۸۸ (مکتوب نمبر ۲۵)

۷۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، فیوض الحرمین، (اردو ترجمہ: محمد سرور بعنوان 'مشاہدات و معارف' ترجمہ فیوض الحرمین)، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۲۵۵-۲۵۶

۸ تحریک آزادی میں علماء کا کردار، محولہ بالا، ص ۱۵۰ (حاشیہ)
۹ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، (مکتوب نمبر ۶)
۱۰ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۱۱۸-۱۱۹
۱۱ تحریک آزادی میں علماء کا کردار، ص ۱۶۰-۱۶۱
۱۲ سعید احمد اکبر آبادی، ہندوستان کی شرعی حیثیت، دینیات فیکلٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، (بدون تاریخ)، ص ۳۷
۱۳ سرور عزیزی، ۱/۳۶
۱۴ حسین احمد مدنی، نقش حیات، ۲/۱۱، تحریک آزادی میں علماء کا کردار، ص ۲۴۶ (حاشیہ نمبر ۲)
۱۵ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۶۰ (مکتوب نمبر ۵)
۱۶ تحریک آزادی میں علماء کا کردار، ص ۲۶۸
۱۷ تحریک آزادی میں علماء کا کردار، ص ۳۳-۳۴ (تقریظ از مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی)
۱۸ تحریک آزادی میں علماء کا کردار، ص ۳۶۶ (محولہ بیاض قلمی حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی مملوکہ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی)
۱۹ شاہ اسمٰعیل شہید (مرتب) صراط مستقیم (مجموعہ ملفوظات سید احمد شہید)، (اردو ترجمہ) کتب خانہ اشرفیہ راشد کمپنی، دیوبند (بدون تاریخ)، ص ۱۰۷
۲۰ غلام رسول مہر، سید احمد شہید، کتاب منزل، لاہور (بدون تاریخ)، ص ۲۵۵-۲۵۶
۲۱ ان کے فتاویٰ کے متون کے لیے ملاحظہ فرمائیں: تحریک آزادی میں علماء کا کردار، ص ۲۵۵-۲۵۶
۲۲ تحریک آزادی میں علماء کا کردار، ص ۲۷۱ (بحوالہ مکتوبات سید احمد شہید، اوراق ۶۷-۶۸)
۲۳ J.F.Blumhardt, *Catalogue of the Hindustani Manuscripts in the Library of India Office,* Oxford University Press, 1926, P.143 (No.268, U-130/III)
۲۴ W.W Hunter, *The Indian Musalmans,* Indological Book House, Delhi, 1969. PP 134-135.
۲۵ نجم الدین اصلاحی (مرتب)، مکتوبات شیخ الاسلام، مجلس یادگار شیخ الاسلام، کراچی، ۱۹۹۴ء، ۲/۱۰۱
۲۶ محمد ایوب قادری، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات)، کراچی، ۱۹۷۶ء،

ص۴۰۴-۴۰۶۔ یہ فتاویٰ اس زمانہ کے اخبارات 'ظفر الاخبار' اور 'صادق الاخبار' میں بھی شایع ہوئے تھے (حوالہ مذکور، ص۴۰۲)

۲۷ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، محولہ بالا، ص۴۰۵-۴۰۶، محمد سلمان منصور پوری، تحریک آزادی ہند میں مسلم علماء اور عوام کا کردار، مرکز نشر و تحقیق، مراد آباد، ۱۴۲۳ھ، ص۵۳-۵۴

۲۸ ہندوستان کی شرعی حیثیت ، ص۴۱-۴۲، نیز ملاحظہ کریں: فضل حق خیرآبادی، الثورۃ الہندیہ، مع اردو ترجمہ: باغی ہندوستان از محمد عبدالشاہد خاں، مبارک پور ۱۹۸۵ء، ص۲۱۵، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، محولہ بالا، ص۴۰۳-۴۰۴

۲۹ سید محمد میاں، علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی (بدون تاریخ)، ص۱۰۰-۱۰۱

۳۰ مکتوبات شیخ الاسلام، محولہ بالا، ۲/۱۰۳-۱۰۴

۳۱ رسالہ 'نصرۃ الابرار' پہلی بار مطبع صحافی، لاہور سے ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۸ء میں شایع ہوا تھا۔ عزیز الحسن صدیقی، کاروانِ فکر، مکتبہ حسن، غازی پور (بدون تاریخ)، ۱/۱۶۲، محمد ایوب قادری، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، ص۵۹۲، بعض اہل قلم نے 'نصرۃ الابرار' کی تالیف مولانا عبدالقادر لدھیانوی سے منسوب کی ہے جو صحیح نہیں ہے۔

۳۲ اس فتویٰ پر تفصیلی تبصرہ اور اس کے مرتبین کے بارے میں مختصر وضاحت کے لیے ملاحظہ فرمائیں: حسین احمد مدنی، نقش حیات، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، ۱۹۵۲ء، ۲/۱۷

Ishtiyaq Husain Qureshi, *Ulama in Politics* Renaissance Publishing House, Delhi, 1985, pp226-228

۳۳ مکتوبات شیخ الاسلام، ۲/۱۳۳

۳۴ کاروان فکر، محولہ بالا، ۱/۱۶۲

۳۵ عبدالرحمٰن کوندو (مولف و مرتب)، الانور، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۷۹ء، ص۴۸۸-۴۸۹، محمد ازہر شاہ قیصر (مرتب)، حیات انور، شاہ منزل ، دیوبند، ۱۹۷۷ء، ص۳۱۰ (مضمون: محمد انوری، حضرت الاستاذ محدث کشمیری)

۳۶ تحریک آزادی ہند میں مسلم علماء او رعوام کا کردار، ص۹۳، سید محمد میاں ، اسیران مالٹا، الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی، ۱۹۷۶ء، ص۲۵۲-۲۵۳

۳۷ اسیران مالٹا، ص۲۵۴

۳۸ سید ابراہیم فکری، ہندوستانی مسلمانوں کا جنگ آزادی میں حصہ، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص۲۱۲-۲۱۳ (بحوالہ: (File No: F(125) Home Confidential

۳۹ اسیر ادروی، تحریک آزادی اور مسلمان، دارالمؤلفین، دیوبند، ۲۰۰۳ء، ص۱۹۶، تحریکِ آزادی میں مسلم علماء اور عوام کا کردار، ص۹۵

۴۰ محمد عدیل عباسی، تحریک خلافت، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۸ء، ص۱۱۱

۴۱ رئیس احمد جعفری، سیرت محمد علی، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۵۰ء، ص۳۷۸-۳۸۱، تحریک خلافت، ص۱۸۳-۱۸۴، تحریک آزادی اور مسلمان، ص۱۹۸

۴۲ سیرت محمد علی، محولہ بالا، ص۴۷۸-۴۸۸، عبدالماجد دریابادی، محمد علی کی ذاتی ڈائری کے چند ورق، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء، ۱/۹۹

۴۳ اس موضوع پر تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: ظفر الاسلام اصلاحی، نمک ستیہ گرہ اور مسلمان، ماہنامہ الرشاد (اعظم گڑھ)، ۴۹/۱۹۱-۱۹۲، جولائی-اگست ۲۰۰۵ء، ص۲۰-۳۲

۴۴ الانور، محولہ بالا، (مقالہ: سبحان الھند احمد سعید، حضرت شاہ صاحب- ایک مکمل لائبریری) ص۴۲۴

۴۵ حوالہ مذکور، ص۴۳۵

۴۶ قاری محمد رضوان اللہ، مولانا انور شاہ کشمیری- حیات و کارنامے، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ ۱۹۷۴ء، ص۷۸

۴۷ کاروان فکر، محولہ بالا، ۱/۱۶۰

۴۸ حدیث کا متن یہ ہے: ایک صحابی (ابوبھیسۃ) نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول، کس چیز سے کسی کو روکنا جائز نہیں؟ فرمایا: پانی- اس نے پھر دریافت کیا: اے اللہ کے نبی- کس چیز سے کسی کو روکنا جائز نہیں؟ فرمایا نمک (**عن امرأة يقال لها بهيسة عن ابيها ... قال: يا رسول الله ! ما الشى الذى لا يحلّ منعه؟ قال: الماء. قال: يا نبى الله! ما الشى الذى لا يحلّ منعه ؟ قال: الملح) سنن ابى داؤد، كتاب الزكاة، باب ما لا يجوز منعه**، حدیث نمبر: ۱۶۶۹

۴۹ الجمعیۃ، مجاہد ملّت نمبر (دہلی)، ۱۹۶۲ء، ص۸۹، اسرار الحق قاسمی، ہندوستان کی جدید تاریخ کے معمار، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مجلّہ تذکیر (غازی پور)، سیریز نمبر ۴۱، ص۲۸

سیر وسوانح

مولانا گوہر رحمٰن کی علمی خدمات

ایک جائزہ

جناب غلام حسین بابر

مولانا گوہر رحمٰن * عصر حاضر کی ایک معروف علمی اور دینی شخصیت ہیں۔آپ کی تدریسی، علمی ،سیاسی اور فقہی خدمات کی فہرست بہت طویل ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ آپ ایک بہترین مدرس، مفسر قرآن، محقق، محدث، مبلغ دین، فقیہہ اور ایک اچھے سیاست دان تھے تو اس میں یقیناً مبالغہ نہ ہوگا۔آپ نے پوری زندگی قرآن وسنت کی تعلیم وترویج میں صرف کی۔آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش شریعت اسلام کا عملی نفاذ تھا۔

علمی خدمات

مولانا گوہر رحمٰن کی علمی اور فقہی خدمات کے دو نمایاں پہلو ہیں:

۱- آپ نے شریعت اسلامی کے نفاذ کے لیے عوام الناس کے فکری شعور کو بیدار کرنے کے مقصد سے کئی علمی موضوعات پر قلم اٹھایا اور کئی کتب تالیف کیں۔آپ کسی بھی علمی موضوع پر بحث کرتے ہیں تو سب سے پہلے قرآن وسنت کے نصوص سے استناد کرتے ہیں، اس کی تائید وتشریح میں فقہاء اسلام اور مفسرین ومحدثین کے اقوال پیش کرتے ہیں۔آپ نے توحید، سنت، اتحاد ملت، خلافت، سیاست اور اسلامی معیشت جیسے اہم موضوعات کے ساتھ دور جدید کے پیش آمدہ مسائل کا حل بھی پیش کیا ہے۔آپ نے دور حاضر کے نظریات میں اشتراکیت، سیکولر جمہوریت اور جدیدیت کی تردید کی۔اسی طرح ملت میں پائی جانے والی فرقہ واریت، بدعات اور تجدد پسندی پر تنقید کی اور انتہائی مثبت انداز میں ان تمام موضوعات سے متعلق اٹھنے والے سوالات کا سنجیدہ جواب دیا اور

قرآنی احکام وقوانین کا حالاتِ حاضرہ اور مسائل جدیدہ پر انطباق کیا۔

۲- شریعت اسلامی کے نفاذ کیلئے آپ نے کئی عملی اقدامات کیے اور کئی تعلیمی اور تحقیقی ادارے قائم کیے۔قومی اسمبلی میں شریعت بل پیش کرنے، مالاکنڈ ڈویژن کے لیے نفاذ شریعت کا مسودہ قانون تیار کرنے اور صوبہ سرحد میں نفاذِ شریعت کیلئے مسودہ قانون تیار کرنے میں بھی آپ کا اہم کردار رہا ہے۔

تصانیف

مولانا گوہر رحمٰن کی علمی خدمات کی حقیقی آئینہ دار آپ کی تالیفات ہیں۔ان تالیفات سے ایک طرف تو آپ کی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف دینی علوم میں آپ کی بصیرت وادراک سے واقفیت ہوتی ہے۔آپ کے علمی وتحقیقی کام کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱- علوم القرآن: آپ کے علمی وتحقیقی کام میں اہم ترین اور زندگی کے آخری ایام میں لکھی جانے والی یہ ایک اہم کتاب ہے، جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔پہلی جلد چھ ابواب اور دوسری جلد میں چار ابواب ہیں۔اس کتاب کو مکتبہ تفہیم القرآن نے اکتوبر ۲۰۰۳ء میں شائع کیا ہے۔اس میں قرآن مجید سے متعلق علوم کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور اس کے ساتھ متجددین اور عقلیت وجدیدیت کے شوقین اصحاب کے منہج تفسیر کا رد کیا گیا ہے۔[۱]

۲- جواہر التوحید: توحید کے موضوع پر لکھی جانے والی مولانا کی یہ اہم کتاب ہے۔اس کتاب میں توحید کی جملہ اقسام کی تنقیح وتحقیق کی گئی ہے اور اس کے ساتھ شرک کی جملہ اقسام کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔یہ کتاب شاہین برقی پریس پشاور سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔یہ کتاب مولانا کے ذاتی کتب خانے مدرسہ تفہیم القرآن مردان میں موجود ہے، لیکن مارکیٹ میں کسی جگہ دستیاب نہیں ہے، البتہ یہ کتاب دسمبر ۱۹۸۶ء میں چھپنے والی ایک دوسری کتاب 'حقیقت توحید وسنت' کا حصہ بن چکی ہے۔[۲]

۳- حقیقت توحید وسنت: یہ کتاب آپ کی علمی اور تحقیقی خدمات کی حقیقی آئینہ دار ہے۔ ۳۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ دسمبر ۱۹۸۶ء میں مکتبہ معارف اسلامی منصورہ لاہور نے

اسے شائع کیا۔ یہ کتاب توحید وسنت سے متعلق ایک بنیادی حیثیت کی حامل ہے، اس میں توحید باری تعالی سے متعلق کئی مباحث کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اور صفات باری تعالی سے متعلق جدید وقدیم فلاسفہ کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایک اہم بحث منصب نبوت اور سنت رسول ﷺ سے متعلق ہے۔[۳]

۴- **اسلامی سیاست**: سیاست کے موضوع پر لکھی جانے والی آپ کی یہ ایک اہم کتاب ہے۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں سیاست اور اس کی اقسام بیان کی گئی ہیں، دوسرے حصے میں غیر اسلامی سیاسی نظریات کا تذکرہ ہے اور تیسرے حصے میں خلافت اسلامیہ کی حقیقت واہمیت واضح کی گئی ہے۔ تمام مباحث میں قرآن وحدیث، سنت خلفاء راشدین، اقوال صحابہ وتابعین، اور ائمہ فقہ کے اقوال سے استدلال کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں کتابیات (Bibliography) کی فہرست دی گئی ہے۔ یہ کتاب ۴۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ مکتبہ معارف اسلامی منصورہ لاہور سے ۱۹۸۱ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔[۴]

۵- **نفاذ شریعت اور علما کا دینی فریضہ**: نومبر ۱۹۷۴ء میں جماعت اسلامی پاکستان کی مجلس شوریٰ نے نفاذ شریعت مہم چلانے کا فیصلہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ اس مہم کا آغاز مردان سے کیا جائے گا۔ اسی مہم کے پیش نظر مولانا گوہر رحمٰن نے دو مضامین 'شرعی سزائیں اور ان کی برکات' اور 'اسلام آئینی مساوات' تحریر کئے تھے، بعد میں ان مضامین کو یکجا کر کے 'نفاذ شریعت اور علما کا دینی فریضہ' کے عنوان سے کتابی صورت میں اپریل ۱۹۷۶ء میں مکتبہ تفہیم القرآن نے شائع کیا۔ یہ کتاب ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بھی مولانا کی ایک دوسری کتاب 'نفاذ شریعت اور اتحاد ملت' کا حصہ بن چکی ہے۔[۵]

۶- **نفاذ شریعت اور اتحاد ملت**: نفاذ شریعت اور اتحاد ملت کے موضوع پر یہ ایک اہم کتاب ہے۔ ۱۸۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے پانچ ابواب ہیں۔ مکتبہ تفہیم القرآن مردان نے اسے ۲۰۰۰ء میں شائع کیا ہے۔ مولانا گوہر رحمٰن شریعت کے نفاذ کے

سلسلے میں علما کے کردار کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ آپ نفاذ شریعت کے لئے اتحاد ملت کی بنیادی شرط لگاتے ہیں، اور ملی اتحاد کو نقصان پہنچانے والے عوامل کا سختی سے رد کرتے ہیں، اس کتاب میں علماء حق اور علما سوء کے کردار کے حوالے سے ایک مفصل بحث بہت اہم نوعیت کی ہے۔[۶]

۷- **عورت کی حکم رانی قرآن وسنت کی روشنی میں:** عورت کی حکم رانی کے حوالے سے مولانا گوہر رحمٰن کی یہ کتاب بہت اہم ہے۔ ۱۹۸۸ء میں جب پاکستان میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت قائم ہوئی تھی تو اس وقت کچھ لوگوں نے عورت کی حکم رانی کو از روئے شریعت جائز قرار دینے کی کوشش کی تھی جو اسلام کے سیاسی اصول اور شرعی احکام کی غلط تعبیر وتشریح تھی، اس موقع پر شرعی احکام کے تحفظ اور ان کو اپنی حقیقی حیثیت میں قائم رکھنے کے لئے مولانا نے قلم اٹھایا اور انتہائی مدلل انداز میں اس بات کو ثابت کیا کہ عورت کی حکم رانی کسی طور پر بھی جائز نہیں ہے۔ اس کتاب میں قرآن وسنت سے دلائل پیش کرنے کے ساتھ فقہاء اسلام اور علماء علم الکلام کی رائیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں مغرب پرست طبقے کی طرف سے عورت کی حکم رانی کے جواز کے سلسلہ میں جو توجیہات کی جاتی ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے۔ عورت کی حکم رانی کے مسئلے کی تفہیم کے لیے یہ کتاب بنیادی مصدر کے طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ کتاب ۱۳۵ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے مکتبہ تفہیم القرآن مردان نے ۲۰۰۰ء میں شائع کیا ہے۔[۷]

۸- **عورت کی دیت شرعی دلائل کی روشنی میں:** عورت کی دیت کے حوالے سے مولانا گوہر رحمٰن کی یہ اہم کتاب ہے جس میں عورت کی دیت کے حوالے سے شرعی نقطۂ نظر کو بڑے مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس اہم مسئلے پر کتاب لکھنے کا سبب یہ ہے کہ صدر پاکستان ضیاء الحق نے پاکستان کے ایک معروف وکیل چودھری الطاف حسین (سابق گورنر پنجاب) کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ کمیٹی کے سربراہ کی حیثیت سے چودہری صاحب نے دیت کے موضوع پر ایک کتاب لکھی۔ اس کے منظرِ عام پر آنے کے بعد دیت کا مسئلہ ایک نزاعی مسئلہ بن گیا اور اس موضوع کے سلسلہ میں کئی

اشکالات پیدا ہو گئے۔ ان اشکالات کا نصوص شرعیہ کی روشنی میں مدلل اور جامع جواب مولانا نے اس کتاب میں دیا ہے۔ دیت کے موضوع پر کئی دوسرے اسکالرز کے نقطۂ نظر کا بھی اس میں جواب دیا گیا ہے، جن میں پروفیسر طاہر القادری اور جناب خالد اسحاق کے نام شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کو مکتبہ تفہیم القرآن مردان نے دسمبر ۱۹۹۲ء میں شائع کیا ہے۔[۸]

۹- **حرمت سود- اشکالات کا علمی جائزہ:** وفاقی شرعی عدالت نے سود سے متعلق کچھ سوالات اہلِ علم کے سامنے رکھے تھے کہ ربا کا مفہوم کیا ہے؟ غیر سودی بنکاری کی عملی صورت کیا ہے؟ حکومت کی جانب سے جاری کردہ قرضوں کا مسئلہ، بنکوں سے غیر سودی قرضے حاصل کرنے کی متبادل تجاویز، نجی اور سرکاری بنکاری میں امتیاز کا مسئلہ، کیا زر نقد کے استعمال پر معاوضہ لینا ربا ہے؟ کیا کرنسی کی قیمت میں کمی کا اثر قرض کی اصل رقم پر نہیں پڑتا؟ کیا سونے اور اشیاء صرف کی قیمتوں میں اضافے کا اثر قرض کی اصل رقم پر نہیں پڑتا؟ ملکی اور غیر ملکی تجارت کی کامیابی کی تجاویز، مسلم اور غیر مسلم ریاست کے مابین سودی کاروبار کا مسئلہ، کیا بیمے کا کاروبار سود کے بغیر چلایا جانا ممکن ہے؟ کیا پراویڈنٹ اور سیونگ اکاؤنٹ پر نفع ربا ہے، کیا انعامی بانڈوں پر دی جانے والی رقم ربا ہے؟ کیا تجارتی قرضوں اور غیر تجارتی قرضوں میں امتیاز کرنا درست ہے؟ بچت پر ابھارنے کے محرکات کیا ہیں؟ کیا اسلامی حکومت مسلمانوں پر ٹیکس لگا سکتی ہے؟ یہ وہ سوالات تھے جن کے جوابات مولانا گوہر رحمٰن نے ۳۰ جون ۱۹۹۱ء کو وفاقی شرعی عدالت کو ارسال کئے تھے، اور اس کے ساتھ سود سے متعلق ایک اور بحث بھی عدالت میں پیش کی تھی۔ ان دونوں کو بعد میں ادارہ معارف اسلامی لاہور نے جنوری ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔[۹]

۱۰- **حرمت سود پر عدالتی بیانات:** مولانا گوہر رحمٰن کے سود سے متعلق وفاقی شرعی عدالت میں پیش کردہ تمام دلائل اور پھر ۱۹۹۹ء میں سپریم کورٹ اپیلیٹ بینچ کے سامنے مولانا کے تمام تحریری بیانات 'حرمت سود پر عدالتی بیانات' کے عنوان سے کتابی صورت میں موجود ہیں۔ اس کتاب کے پانچ ابواب ہیں۔ پہلے اور دوسرے ابواب میں وفاقی شرعی

عدالت میں آپ کے سود سے متعلق دلائل مذکور ہیں، بقیہ تین ابواب میں سپریم کورٹ میں آپ کے پیش کردہ دلائل کو نقل کیا گیا ہے۔ یہ دلائل ربا کی حقیقت، بین الاقوامی سودی معاہدوں اور کرنسی کے بارے میں اشکالات کے جواب کی صورت میں ہیں۔ عصر حاضر میں سود کے معاملات کے سمجھنے میں مولانا گوہر رحمٰن کے یہ دلائل بہت معاون اور مفید ہو سکتے ہیں۔ ان دلائل کو یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کیا جائے تو یہ ایک اچھی خدمت ہوگی۔ یہ کتاب ۳۸۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ مکتبہ تفہیم القرآن مردان نے اسے اگست ۲۰۰۰ء میں شائع کیا ہے۔ [۱۰]

۱۱- **اجتہاد اور اوصاف مجتہد:** 'اجتہاد اور اوصاف مجتہد' کے عنوان سے مولانا نے ایک مختصر کتاب لکھی تھی جو ۵۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ فروری ۱۹۹۰ء میں حراء پبلیکیشنز، اردو بازار لاہور نے اس شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں اجتہاد کے مفہوم، اجتہاد کی اقسام، مجتہد اور اوصاف مجتہد، قیاس، ارکان قیاس اور قیاس کے قانونی مقام کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اجتہاد اور اس سے متعلقہ تمام مباحث کا تفصیلی تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے۔ فقہ و قانون کے طلبہ و اساتذہ کیلئے یہ کتابچہ رہنمائی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ [۱۱]

۱۲- **اجتہاد و تقلید اور امام ابوحنیفہؒ کے فقہی اصول:** اس کتاب کو مولانا گوہر رحمٰن نے ۲۰۰۰ء میں تالیف کیا۔ اس کا اصل محرک وہ مختصر کتابچہ ہے جو ۱۹۹۰ء میں 'اجتہاد اور اوصاف مجتہد' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس کتابچے کو اہل علم نے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا اور لوگوں کے شدید اصرار پر آپ نے 'اجتہاد و تقلید اور امام ابوحنیفہؒ کے فقہی اصول' کے عنوان سے یہ کتاب مکمل کی۔ 'اجتہاد اور اوصاف مجتہد' نامی کتابچہ کو اس کتاب کا پہلا باب بنا دیا گیا ہے، دوسرے تین ابواب میں مسئلہ تقلید، امام ابوحنیفہؒ کے فقہی اصول، اور امام ابوحنیفہؒ کے سوانح و مناقب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں حالات و واقعات میں تغیر و تنوع ناگزیر ہے اور اس مناسبت سے جدید مسائل کا وقوع پذیر ہونا لازمی امر ہے۔ ان جدید مسائل کے حل کے لئے اجتہاد کیسے کیا جائے؟ اور اس کی عملی صورت کیا ہو؟ اس پہلو سے مولانا

کی یہ کتاب بنیادی حیثیت کی حامل ہے، ۲۳۸ صفحات کی اس کتاب کو مکتبہ تفہیم القرآن مردان نے ۲۰۰۰ء میں شائع کیا۔[۱۲]

۱۳- **تصویر سازی اور فوٹو گرافی کی شرعی حیثیت:** یہ کتاب تصویر سازی اور فوٹو گرافی کی شرعی حیثیت کو واضح کرتی ہے۔ ۶۲ صفحات کی اس کتاب کو اکتوبر ۱۹۹۹ء میں مکتبہ تفہیم القرآن نے شائع کیا۔ دور جدید میں تصویر سازی اور فوٹو گرافی کے ذیل میں کئی اشکالات پائے جاتے ہیں۔ اس مختصر کتاب میں مولانا گوہر رحمٰن نے تصویر سازی کے معاملے میں علامہ یوسف قرضاوی کے موقف کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ اس کے ساتھ مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا تقی عثمانیؒ کے دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ مولانا گوہر رحمٰن نے جس استدلال اور جامعیت کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے اس سے ان تمام شبہات اور اشکالات کا ازالہ ہو جاتا ہے جو تصویر سازی کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں۔[۱۳]

۱۴- **مسئلہ وسیلہ اور امام ابن تیمیہؒ کے حالات:** مولانا گوہر رحمٰن کی کتب میں اس کتاب کو یہ منفرد مقام حاصل ہے کہ مولانا نے اسے پشتو زبان میں تحریر کیا۔ یہ کتاب ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو شعبہ نشر و اشاعت انجمن اسلامیہ ہوتی مردان نے شائع کیا تھا۔ اس کتاب کو اہلِ حدیث حضرات نے بہت پسند کیا اور انہوں نے صوبہ سرحد میں اس کو بہت پھیلایا، تاکہ وسیلہ سے متعلق اہم مباحث لوگوں کی سمجھ میں آسکیں۔ اس کتاب میں وسیلہ کے مفہوم اور اقسام کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ابتداء میں کچھ بنیادی قواعد دیئے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں امام ابن تیمیہؒ کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں اور وسیلہ سے متعلق حافظ کفایت اللہ کے نظریات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔[۱۴]

۱۵- **مقدمہ دروس بخاری:** مقدمہ دروس بخاری ۱۷۱ صفحات پر مشتمل ہے، ۲۰۰۳ء میں مکتبہ تفہیم القرآن نے اسے شائع کیا۔ دس مباحث پر مشتمل اس مقدمہ کی ترتیب اور ربط بڑا فطری اور پر مغز ہے۔ بحث اول میں حدیث کے استاد اور طالب علم کے آداب، بحث دوم میں حدیث کا مفہوم، بحث سوم میں علم حدیث کی تعریف، بحث چہارم میں علم

حدیث کی غرض وغایت، بحث پنجم میں علم حدیث اور علماء حدیث کا مقام، بحث ششم میں حجیت حدیث بالفاظ قرآنی بیان کی گئی ہے، بحث ہفتم میں کتابت حدیث، بحث ہشتم میں تدوین حدیث، بحث نہم میں تراجم امام بخاری اور بحث دہم میں امام بخاری کا تعارف تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اس مقدمہ کے ذیل میں ایک اہم بات یہ ہے کہ مولانا گوہر رحمٰن بخاری کے پہلے باب کی تیسری حدیث کی شرح لکھ رہے تھے کہ عین اسی حالت میں آپ کی روح پرواز کر گئی۔ ۱۵

۱۶- **شریعت ایکٹ ۱۹۹۱ء کا علمی جائزہ:** محترم نواز شریف نے ۱۹۹۱ء میں ایک شریعت بل قومی اسمبلی سے پاس کرایا۔ اس بل کے ابتدائی حصے میں شریعت کی حقیقت کو تسلیم کیا گیا، لیکن اس ایکٹ کی دفعہ ۱۸ میں اقتصادی نظام کو دفعہ ۲۰ اور ۲۱ میں عائلی اور قانون سازی کے امور کو شریعت سے مستثنیٰ قرار دیا۔ مولانا گوہر رحمٰن نے شریعت ایکٹ کی ان خامیوں کا علمی جائزہ لیا اور اس حقیقت کو واضح کیا کہ حکم راں کس طرح شریعت کے نام پر غیر ذمہ دارانہ طرز عمل کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ شریعت ایکٹ ۱۹۹۱ء پر لکھا ہوا آپ کا علمی جائزہ ۱۶۵ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کو مکتبہ تفہیم القرآن مردان نے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا۔ مولانا نے علمی جائزہ کو پیش کرتے ہوئے کسی قسم کی مداہنت یا کم زوری کا مظاہرہ کیے بغیر ایک عالم حق کا کردار ادا کرتے ہوئے اپنے موقف کو پیش کیا ہے۔ ۱۶

۱۷- **تفہیم المسائل:** مولانا گوہر رحمٰن کی فقہی خدمات کی حقیقی آئینہ دار 'تفہیم المسائل' ہے جو ۱۹۸۱ء سے ۲۰۰۰ء تک مختلف استفسارات کے جوابات کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ فقہی مسائل کے ذیل میں آپ کا طرز عمل یہ ہے کہ آپ ہمیشہ فقہی مسائل میں قرآن وسنت سے استدلال کرتے ہیں، تائید وتشریح میں فقہاء اسلام اور مفسرین ومحدثین کے اقوال کو پیش کرتے ہیں۔

تفہیم المسائل چھ حصوں پر مشتمل ہے، تمام جلدوں کا تعارف درج ذیل ہے:

۱۔ حصۂ اول: اس مجموعے میں آٹھ خصوصی مقالے شامل ہیں، جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

۱- اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ کی تفسیر
۲- فلسفۂ حج
۳- ذبیحۂ اہل کتاب کے حلال ہونے کی شرائط
۴- مردوں اور عورتوں کی جماعت میں عورت کی امامت (ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے پر تنقید)
۵- داڑھی منڈوانا اور کتروانا
۶- کیسٹوں میں دف وغیرہ کی موسیقی کے بارے میں شرعی حکم
۷- پردے کے بارے میں ناظمۂ حلقہ خواتین جماعت اسلامی کے سوالات کے جوابات
۸- سیاسی پارٹیوں کی شرعی حیثیت (وفاقی شرعی عدالت کے سوالنامے کا جواب)

ان آٹھ خصوصی مقالوں کے علاوہ اس مجموعے میں ۱۱۶۵ استفسارات کے جوابات شامل ہیں ان میں ۲۱ سوالات اسلامی میڈیکل ایسوسی ایشن کے ہیں، جو جدید طبی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے جوابات قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں دیے گئے ہیں، مسائل کے اس مجموعے کو تین عنوانات پر تقسیم کیا گیا ہے۔

۱- تفسیر آیات وتخریج وتشریح
۲- عام فقہی مسائل
۳- تحریک اسلامی سے متعلق مسائل

مسائل کی تحقیق میں فقہی تعصب وتحزّب سے احتراز کیا گیا ہے، تفہیم المسائل حصۂ اول ۶۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور مکتبہ تفہیم القرآن مردان نے اسے اگست ۲۰۰۰ء میں شائع کیا ہے۔[۱۷]

۲۔ حصۂ دوم: اس حصہ میں صرف معاشی مسائل سے بحث کی گئی ہے، اس میں سترہ سوالات کے جوابات اور چھ تفصیلی مقالات ہیں۔ ان مقالات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱- معاشی انصاف کے چند اصول: یہ مقالہ ۱۹۶۳ء میں جماعت اسلامی کی اقتصادی کمیٹی کے سوالنامے کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

۲- ادھار اور نقد قیمتوں میں فرق رکھنا: یہ مقالہ اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر

اہتمام ایک سیمینار میں ۲۴ دسمبر ۱۹۸۴ء کو پیش کیا گیا تھا۔

۳۔ مرکزی زکوٰۃ کونسل اسلام آباد کے سوال نامے کا جواب

۴۔ طبقۂ مترفین اور عدل اجتماعی: یہ مقالہ جناب اسعد گیلانی کی تجویز پر لکھا گیا تھا۔

۵۔ کیا اسلامی حکومت اپنی مسلمان رعایا پر ٹیکس لگا سکتی ہے؟ یہ مقالہ وفاقی شرعی عدالت کے سوال نامے کے جواب میں لکھا گیا۔

۶۔ وفاقی شرعی عدالت کے 'سود' کے بارے میں سوال نامے کا جواب اور 'بین الاقوامی سود' پر مشتمل مقالہ بھی اس میں شامل ہے۔

یہ حصہ ۳۷۵ صفحات پر مشتمل ہے جنوری ۱۹۹۸ء میں مکتبہ تفہیم القرآن مردان نے اسے شائع کیا۔[۱۸]

۳۔ حصۂ سوم: اس حصے میں کل ۱۲۵ سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں، جن میں سے ۱۹ سوالات تفسیر آیات اور تشریح احادیث سے متعلق ہیں۔ ۶۲ سوالات عام فقہی مسائل سے متعلق ہیں، ۳۶ سوالات کا تعلق معاشی مسائل سے ہے اور ۸ سوالات تحریکی مسائل سے متعلق ہیں، ۴۳۵ صفحات پر مشتمل اس حصہ کو بھی مکتبہ تفہیم القرآن نے ستمبر ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔[۱۹]

۴۔ حصۂ چہارم: اس مجموعۂ مسائل میں کل ۱۸۲ سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں، جن میں ۱۷ سوالات تفسیر و تاویل آیات اور تخریج و تشریح احادیث سے متعلق ہیں۔ ۱۰۷ عام فقہی مسائل سے متعلق ہیں' ۴۵ کا تعلق معاشی مسائل سے ہے' ۱۳ سوالات تحریکی مسائل سے متعلق ہیں،

یہ مجموعہ ۴۷۰ صفحات پر مشتمل ہے اور مکتبہ تفہیم القرآن مردان سے ستمبر ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔[۲۰]

۵۔ حصۂ پنجم: یہ حصہ ۱۹ مقالات پر مشتمل ہے جن کے متنوع موضوعات ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ زکوۃ وعشر آرڈیننس مجریہ ۱۹۸۰ء پر تبصرہ

۲- خرم جاہ مراد مرحوم کے سوالات کے جوابات (ایمان و اسلام، اور دعوت و تبلیغ سے متعلق اسلامی احکام)
۳- جماعت اسلامی قرآن وسنت کے آئینے میں
۴- امت مسلمہ کی پالیسی اور حکمت عملی
۵- امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز اور ان کا حل
۶- نقاب کے بارے میں ارشاد احمد حقانی کے آرٹیکل پر تبصرہ
۷- التزام جماعت کا صحیح مفہوم
۸- فکر مودودی کیا ہے؟
۹- الجماعت کے صحیح مفہوم پر تنقیدی مضامین کا جائزہ
۱۰- رمضان اور صیام رمضان
۱۱- شباب ملی اور تحریک اسلامی
۱۲- اشراقی تجدد کا جائزہ
۱۳- اقامت دین اور اعلاء دین
۱۴- جماعت اسلامی کی تحریک اور اس کے محرکات
۱۵- تعلیم نسواں
۱۶- پوتے کی میراث
۱۷- کیا پوتوں اور نواسوں کے لئے وصیت فرض ہے؟
۱۸- نفاذ شریعت اور پندرہواں ترمیمی بل
۱۹- ذکر الٰہی کی حقیقت اور فضیلت

یہ مجموعہ ۵۵۴ صفحات پر مشتمل ہے اور مکتبہ تفہیم القرآن نے اسے اگست ۲۰۰۲ء میں شائع کیا۔[۲۱]

۶۔ حصۂ ششم: اس حصہ میں کل ۱۵۸ سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں، جن میں ۱۷ سوالات تفسیر آیات وتشریح احادیث سے متعلق، ۹۲ سوالات فقہی امور سے متعلق، ۳۱ سوالات معاشی امور سے متعلق اور ۱۸ سوالات تحریکی مسائل سے متعلق ہیں۔

کل صفحات ۵۶۶ ہیں۔ مولانا اپنی زندگی میں اس حصے کا دیباچہ نہیں لکھ سکے تھے، اس کا دیباچہ آپ کے بیٹے ڈاکٹر عطاء الرحمٰن نے لکھا ہے، مکتبہ تفہیم القرآن نے اگست ۲۰۰۳ء میں اسے شائع کیا۔[۲۲]

علمی وفقہی خدمات کا عملی پہلو

مولانا گوہر رحمٰن نے شریعت اسلامی کے نفاذ کیلئے کئی عملی اقدامات کیے، ان میں مدرسہ جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن، جامعہ اسلامیہ تفہیم القران للنساء والبنات، رابطۃ المدارس الاسلامیہ، اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ اور جمعیۃ اتحاد العلما کا قیام، متحدہ مجلس عمل اور نوجوانوں کے لئے شباب ملی کے قیام میں بنیادی کردار، قومی اسمبلی میں شریعت بل پیش کرنا، مالاکنڈ ڈویژن کیلئے نفاذ شریعت کے لئے مسودۂ قانون تیار کرنا، اور صوبۂ سرحد میں نفاذ شریعت کے لئے مسودہ قانون تیار کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

۱۔ مدرسہ جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن:

مولانا گوہر رحمٰن نے اس مدرسے کی بنیاد ۱۹۶۷ء میں محلّہ رستم خیل مردان میں رکھی، اس مدرسہ میں ہزاروں طلبہ تعلیم حاصل کر چکے ہیں، آپ کے ہاں دینی مدارس کی ایک خاص اہمیت ہے، آپ نے دینی مدارس کی ضرورت کی دس وجوہ بیان کی ہیں، جو انتہائی اہم ہیں:

۱- اللہ کی بندگی کے تقاضے پورے کرنا اور اس کے دین پر عمل کرنا، علم دین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۲- دعوت دین اور اقامت دین ونفاذ شریعت کے لئے جدوجہد کرنا علم دین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۳- اسلامی انقلاب کے لئے فکری انقلاب ضروری ہے اور فکری انقلاب علم دین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۴- اسلامی ریاست کے قیام کیلئے اصلاح معاشرہ ضروری ہے اور اصلاحی کام علم دین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۵- اسلامی ریاست کو چلانے کیلئے اسلامی قیادت ضروری ہے اور اسلامی قیادت علم دین

کے بغیر ممکن نہیں ہے۔
۶- غیر اسلامی افکار پر تنقید کرنا، اور علم و تحقیق کے میدان مین ان کا مقابلہ کرنا علم دین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔
۷- امت مسلمہ کے قائدین علماء دین ہیں اور علماء دین مدارس میں تیار ہوتے ہیں۔
۸- قرآن کی تعلیم و تبلیغ جہاد کبیر ہے اور قرآن کا علم دینی مدارس ہی میں حاصل ہوسکتا ہے۔
۹- قرآن وسنت کی تدریس کی مجالس پر سکینت اور رحمت نازل ہوتی ہے اور یہ مجالس دینی مدارس میں ہی قائم ہوتی ہیں۔
۱۰- علم دین حاصل کرنا مسلمان مردوں وعورتوں پر فرض ہے اور یہ فرض دینی مدارس میں ادا ہوسکتا ہے۔[۲۳]

جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن کے مقاصد اور اہداف:

جامعہ اسلامیہ ایک خاص علمی اور تحقیقی ادارہ ہے جو فرقہ واریت سے بالاتر ہوکر قرآن وسنت کی تعلیم و تحقیق اور طلبہ کی تربیت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اس تعلیمی ادارے کا مقصد ایسے علماء تیار کرنا ہے جو درج ذیل صفات کے حامل ہوں:
۱- جو حق جو، حق گو اور حق پرست ہوں۔
۲- جو سطحی اور سرسری نہیں بلکہ گہرے تحقیقی علم کا ذوق وشوق رکھنے والے ہوں۔
۳- جو علم پر عمل کرتے ہوں اور علم کے اس ہتھیار کو اصلاح نفس اور اصلاح معاشرہ کیلئے استعمال کرتے ہوں۔
۴- جو دعوت دین اور اقامت دین کے لئے جدوجہد کا جذبۂ صادق رکھتے ہوں۔
۵- جو فروعی اور اجتہادی اختلاف کو امت میں افتراق کا ذریعہ نہ بناتے ہوں اور فرقہ واریت اور گروہی عصبیت سے پاک ہوں۔
۶- جو اتحاد امت کے داعی ہوں اور اصول دین پر امت کو متحد کرنے کیلئے کوشاں ہوں۔
۷- جو قرآن وسنت کی تعلیم اور تبلیغ اور دعوت وارشاد میں مصروف عمل رہتے ہوں۔
۸- جو شرک وبدعت اور غیر اسلامی افکار کے ابطال اور رد میں مشغول رہتے ہوں۔
۹- جو تجدّد فی الدین کے جراثیم سے پاک اور تجدید واحیاء دین کے لئے کوشاں ہوں۔

۱۰- جو ظالم حکمرانوں، سرمایہ داروں اور سیکولر سیاست دانوں کے آلۂ کار نہ ہوں۔[۲۴]

جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن اس وقت ملک کی ایک معروف دینی درس گاہ ہے جس میں سیکڑوں طلبہ حصول علم میں مصروف ہیں۔ حقیقت میں یہ مولانا کی بہت بڑی علمی اور دینی خدمت ہے۔

۲۔ جامعۂ اسلامیہ تفہیم القرآن للنساء والبنات:

مولانا گوہر رحمٰن نے جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن للنساء والبنات بھی مردان میں قائم کیا ہے جس میں سیکڑوں طالبات دین کا علم حاصل کر رہی ہیں۔ اس مدرسہ میں درج ذیل شرائط کی حامل طالبات کو داخلہ دیا جاتا ہے:

۱- شعبۂ حفظ و تجوید میں ہر اس طالبہ کو داخلے کی اجازت ہے جو ناظرۂ قرآن پڑھ چکی ہو اور عمر دس سال سے کم نہ ہو۔

۲- شعبۂ درس نظامی میں میٹرک پاس طالبات کو داخلہ دیا جاتا ہے۔

۳- مڈل سے کم درجے کی طالبات کیلئے ایک سالہ کورس رکھا گیا ہے۔[۲۵]

اس مدرسہ میں تعلیم کی درجہ بندی کچھ اس طرح سے ہے:

۱- دینی علوم کے چار درجوں کا نصاب ۲- دورۂ تفسیر ۳- تحفیظ و تجوید

جامعۂ اسلامیہ تفہیم القرآن للنساء والبنات کا قیام مولانا گوہر رحمٰن کی ایک عظیم خدمت اور علمی اور فکری بصیرت کا عملی ثبوت ہے، کیونکہ مردوں کیلئے تو ملک کے ہر کونے میں مدارس قائم ہیں، لیکن عورتوں کیلئے اس قسم کے تعلیمی ادارے قائم کرنا مشکل لیکن بہت ضروری ہے۔

۳۔ ادارۂ تفہیم الاسلام مردان کا قیام:

مولانا گوہر رحمٰن نے مختلف مسائل کی تنقیح و تفہیم کیلئے تصنیف و تالیف کے اس تحقیقی ادارے کی بنیاد رکھی، اس ادارے کے اغراض و مقاصد درج ذیل ہیں:

۱- جدید حل طلب مسائل کی تنقیح اور ان کے شرعی حکم کی تحقیق

۲- دینی احکام کی جدید عصری طرز تحریر میں تدوین و تشریح

۳- سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین کے درمیان پہلے سے جو مسائل اختلافی چلے آرہے ہیں

دینی اور ملی مصالح کی بنیاد پر یا دلیل کی قوت سے کسی ایک رائے کو ترجیح دینا۔
۴-نصوص کی اجماعی تعبیر اور اہل سنت کی متفقہ رائے کے خلاف متجدّدین کی تعبیرات وتاویلات پر علمی تنقید کرنا۔
۵-قومی اور بین الاقوامی مسائل میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کرنا۔
۶-استفسارات کے جوابات دینا۔
۷-عوام کے اندر فہم دین، دعوت دین، محبت دین اور فکر اقامت دین پیدا کرنے کے لیے دعوتی، تعلیمی، تبلیغی اور اصلاحی کام کرنا۔
۸-نسلی، لسانی، علاقائی، جماعتی وگروہی اور فرقہ وارانہ عصبیتوں کے استحصال اور امت مسلمہ کے اتحاد و یکجہتی کیلئے علمی اور دعوتی میدانوں میں کام کرنا۔

ادارۂ تفہیم الاسلام کے تحت مجلس بحث وتحقیق قائم کی گئی ہے اور ملک کے طول وعرض سے جید علماء اس مجلس کے ممبر منتخب ہوتے ہیں۔ جدید مسائل کی تحقیق میں علوم جدیدہ کے ماہرین سے بھی یہ مجلس استفادہ کرتی ہے، اس مجلس کے زیر اہتمام مختلف قسم کی تدریسی، دعوتی اور دیگر سرگرمیاں جاری ہیں۔ ادارۂ تفہیم الاسلام کے تحت تصنیف وتالیف کا کام بھی ہوتا ہے اب تک کئی کتب اس ادارہ کے ذریعہ منظر عام پر آچکی ہیں۔

۴۔ رابطۃ المدارس الاسلامیہ کا قیام:

۲۷-۲۸/ فروری ۱۹۸۳ء کو منصورہ لاہور میں ملک کے مدارس کا ایک کنونشن ہوا۔ اس کا انعقاد مولانا گوہر رحمٰن، مولانا محمد چراغ، مفتی سیاح الدین کاکاخیل اور مولانا گلزار احمد مظاہری کے مشورہ سے ہوا، اس کنونشن میں تین سو علماء شریک ہوئے۔ اس میں مدارس کے لیے نیا نصاب مقرر کیا گیا، رابطۃ المدارس الاسلامیہ کی تنظیم بنائی گئی، امتحانی بورڈ تشکیل دیا گیا۔ مفتی سیاح الدین کاکاخیل اس کے صدر منتخب ہوئے، لیکن ان کی حادثاتی موت کے بعد، مولانا گوہر رحمٰن اس کے صدر مقرر ہوئے۔ آپ کی سرپرستی میں اس ادارے نے بہت ترقی کی اور تحریک اسلامی سے وابستہ تمام مدارس ایک لڑی میں پرو دیے گئے۔ اس کوشش کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ مدارس کے خلاف حکم رانوں کی مذموم کوششیں ناکام بنائی جاسکیں۔

۵۔ اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ:

پوری دنیا میں استعماری قوتیں مدارس اسلامیہ کے خلاف پروپیگنڈہ کررہی ہیں کہ پاکستان میں قائم مدارس دینیہ بنیاد پرستی، دہشت گردی اور انتہاپسندی کا مرکز ہیں، مغرب نواز حکم رانوں نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ مدارس دینیہ کے نصاب کو تبدیل کیا جائے اور مدارس دینیہ پر پابندیا ں لگائی جائیں۔ مولانا گوہر رحمٰن نے مدارس دینیہ کے خلاف مغربی سازشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، آپ کی کوششوں سے تحفظ مدارس دینیہ کنونشن منعقد ہوئے، آپ نے ان کنونشنوں میں اپنے عالمانہ، مجاہدانہ اور متکلمانہ خطابات کے ذریعے مدارس دینیہ کے تحفظ کو یقینی بنایا اور مدارس دینیہ کے سلسلے میں حکم رانوں کے رویہ پر کڑی نکتہ چینی کی، اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ کے پلیٹ فارم کو موثر بنانے میں آپ کا کلیدی کردار رہا ہے۔

۶۔ جمعیۃ اتحاد العلما کا قیام:

۱۹۶۳ء میں جمعیۃ اتحاد العلماء کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے قیام میں مولانا گوہر رحمٰن کا کردار کلیدی نوعیت کا ہے۔ آپ اتحاد امت کے ساتھ علما کے اتحاد پر بھی بہت زور دیتے تھے۔ اس مقصد کے پیش نظر آپ نے نفاذ شریعت اور اتحاد ملت کے عنوان سے ایک اہم کتاب لکھی ہے۔ جمعیۃ اتحاد العلماء کے تاسیسی اجلاس میں بھی آپ شریک تھے اور پھر اس پلیٹ فارم سے آپ نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

۷۔ متحدہ مجلس عمل کے قیام میں اہم کردار:

مولانا گوہر رحمٰن تحزّب کے سخت خلاف تھے دینی جماعتوں کا اتحاد آپ کی عظیم خواہش تھی۔ اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آپ نے بھرپور کوششیں کیں، بالآخر ان کوششوں کا نتیجہ متحدہ مجلس عمل کے قیام کی صورت میں آیا، آپ مجلس عمل کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں جب بیماری نے آپ کو گھیر رکھا تھا اس وقت بھی اپنے بیٹے ڈاکٹر عطاء الرحمٰن سے معلومات لیتے اور دینی جماعتوں کے اس اتحاد سے متعلق ہدایات دیتے رہتے تھے۔

۷۔ شریعت بل کی تیاری:

مولانا گوہر رحمٰن ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں NA-47 مردان سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے آپ پاکستان میں شریعت کے عملی نفاذ کے خواہاں تھے۔ اس مقصد کے پیش نظر آپ نے ایک شریعت بل ترتیب دیا، یہ بل ۱۲/دسمبر ۱۹۸۵ء کو ایوان میں پیش کیا گیا، ۲۶/جنوری ۱۹۸۶ء کو سینٹ میں اس پر بحث ہوئی، اس بل میں اسلامی قانون اور اس کے نفاذ کا پورا طریقۂ کار موجود تھا، لیکن جب اسے قومی اسمبلی اور سینٹ میں پیش کیا گیا تو حکم راں طبقہ کے پارلیمنٹیرین اور سینٹرز نے شدید اعتراضات کیے، پروفیسر خورشید صاحب [۲۶]، میاں طفیل محمد [۲۷]، سید اسعد گیلانی [۲۸] اور خود مولانا گوہر رحمٰن نے ان تمام اعتراضات کے جوابات دیے۔

بہرحال مولانا گوہر رحمٰن کا ترتیب دیا ہوا شریعت بل اسلامی دستور سازی کے حوالے سے ایک اہم رہنما دستاویز ہے۔

۸۔ مالاکنڈ ڈویژن کیلئے نفاذ شریعت کا مسودۂ قانون:

مالاکنڈ ڈویژن کے لوگوں کا ہمیشہ سے یہ شدید مطالبہ رہا ہے کہ وہاں پر شریعت کا نفاذ عملاً کیا جائے۔ اس سلسلے میں اس علاقے کے لوگوں کی کوششیں تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے بعد جب مالاکنڈ میں یہ تحریک چلی کہ 'شریعت یا شہادت'، تو مولانا گوہر رحمٰن نے لوگوں کے جذبات و احساسات کے عین مطابق مالاکنڈ ڈویژن کے لیے ایک مسودۂ قانون تیار کیا اور حکومت کے حوالے کیا۔ اس مسودۂ قانون کی ۲۲/دفعات ہیں اس مسودہ میں یہ کہا گیا ہے کہ مالاکنڈ ڈویژن میں شریعت کی بالادستی ہوگی۔ شرعی عدالتیں قائم کی جائیں گی، کوئی شخص عدالتی احتساب سے بالاتر نہیں ہوگا، تعلیمی اداروں میں اسلامی تعلیم و تربیت کا بندوبست ہوگا، سود کا مکمل خاتمہ ہوگا، سود کے متبادل کے طور پر شرکت اور مضاربت کا نظام رائج ہوگا، زکوۃ کا نظام قائم کر کے زکوۃ کی رقم مالاکنڈ کے مستحقین میں تقسیم کی جائے گی۔ [۲۹]

۹۔ صوبۂ سرحد کیلئے نفاذ شریعت کا مسودۂ قانون:

گزشتہ انتخابات میں صوبۂ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت قائم ہوئی تو آپ نے ۵؍جنوری ۲۰۰۳ء کو پروفیسر محمد ابراہیم کو ایک خط کے ذریعے نفاذ شریعت کی طرف متوجہ کیا اور اس کے لئے انہیں صوبائی سطح پر نفاذ شریعت ایکٹ کا ایک مسودہ تیار کر کے بھیجا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اللہ تعالی کی عطا کردہ اس حکومت اور پارلیمانی قوت کی بنیاد پر مجلس عمل کے قائدین، وزراء اور منتخب نمائندے ذمہ دار ہیں کہ اسلامی نظام، نفاذ شریعت اور اصلاح معاشرہ کیلئے نتیجہ خیز قانونی اور انتظامی اقدامات کریں، ورنہ خدا اور خلق خدا کے حساب کا سامنا کرنا پڑے گا۔[۳۰]

صوبۂ سرحد کے لیے آپ نے جو مسودۂ قانون تیار کیا اس کی چودہ دفعات ہیں۔ آپ کا تیار کیا ہوا یہ مسودۂ قانون شریعت ایکٹ ۱۹۸۶ء اور شریعت ایکٹ مالاکنڈ ڈویژن سے بہت حد تک مماثلت رکھتا ہے۔

حواشی ومراجع

*مولانا گوہر رحمٰن ۵؍فروری ۱۹۳۶ء میں گاؤں چمراسی درہ شنگلی تحصیل وضلع مانسہرہ میں پیدا ہوئے، والد کا نام مولوی شریف اللہ ہے، دینی تعلیم حضرت مولانا عبدالمالک امام شیخو سر ڈھیری مسجد سے حاصل کی۔ ایک طویل عرصہ درس وتدریس میں گزارا، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ کی کتاب 'الجہاد فی الاسلام' کے مطالعہ نے آپ کو جماعت اسلامی میں شمولیت پر آمادہ کیا۔ جماعت اسلامی صوبۂ سرحد کے امیر اور مرکزی شوریٰ کے رکن رہے۔ دو دفعہ قومی اسمبلی کے رکن بھی بنے، ایوان اقتدار میں ٹھوس موقف، مدلل گفتگو اور مثبت کردار کی بدولت 'مرد ایوان' کے لقب سے مشہور ہوئے، ۱۸؍مارچ ۲۰۰۳ء کو انتقال ہوا، آپ کی آخری آرام گاہ مدرسۂ تفہیم القرآن مردان کے احاطے میں ہے۔

۱- علوم القرآن، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۲۰۰۳ء

۲- جواہر التوحید، شاہین برقی پریس، پشاور، ۱۹۵۹ء

۳- حقیقت توحید وسنت، مکتبہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور، ۱۹۸۶ء

۴- اسلامی سیاست، مکتبہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور، ۱۹۸۱ء

۵- نفاذ شریعت اور علما کا دینی فریضہ، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۱۹۷۶ء

۶- نفاذ شریعت اور اتحاد ملت، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۲۰۰۰ء

۷- عورت کی حکم رانی قرآن وسنت کی روشنی میں، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۲۰۰۰ء
۸- عورت کی دیت شرعی دلائل کی روشنی میں، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۱۹۹۲ء
۹- حرمتِ سود، اشکالات کا علمی جائزہ، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۳ء
۱۰- حرمتِ سود پر عدالتی بیانات، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۲۰۰۰ء
۱۱- اجتہاد اور اوصافِ مجتہد، حرا پبلیکیشنز اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۰ء
۱۲- اجتہاد وتقلید اور امام ابوحنیفہؒ کے فقہی اصول، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۲۰۰۰ء
۱۳- تصویر سازی اور فوٹو گرافی کی شرعی حیثیت، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۱۹۹۹ء
۱۴- مسئلہ وسیلہ اور امام ابن تیمیہؒ کے حالات، شعبۂ نشر واشاعت انجمن اسلامیہ ہوتی، مردان
(یہ کتاب چوں کہ پشتو زبان میں ہے، اس لیے اس کو سمجھنے کے لیے پشتو زبان کے ماہر اور شعبۂ صحافت پنجاب یونی ورسٹی کے طالب علم برادر ضیاء الحق نے خصوصی رہ نمائی کی)
۱۵- مقدمۂ دروس نجاری، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۲۰۰۳ء
۱۶- شریعت ایکٹ کا علمی جائزہ، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۱۹۹۱ء
۱۷- تفہیم المسائل جلد اول، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۲۰۰۰ء
۱۸- تفہیم المسائل جلد دوم، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۱۹۹۸ء
۱۹- تفہیم المسائل جلد سوم، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۱۹۹۹ء
۲۰- تفہیم المسائل جلد چہارم، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۱۹۹۹ء
۲۱- تفہیم المسائل جلد پنجم، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۲۰۰۲ء
۲۲- تفہیم المسائل جلد ششم، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۲۰۰۳ء
۲۳- جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن کا تعارف اور مختصر تاریخ، ص ۱۰
۲۴- جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن کا تعارف اور مختصر تاریخ، ص ۳۱
۲۵- جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن للنساء والبنات کا تعارف
۲۶- پروفیسر خورشید احمد، شریعت بل کا اصل مقصد، ضرورت واعتراضات کا علمی جائزہ، ص ۱، ۲
۲۷- میاں طفیل محمد، نویں دستوری ترمیم اور شریعت بل کا فرق
۲۸- سید اسعد گیلانی، پاکستان میں نفاذ شریعت کیوں، شائع کردہ متحدہ شریعت محاذ لاہور، ۱۹۸۶ء
۲۹- مولانا گوہر رحمٰن، نفاذ شریعت اور اتحاد ملت، ص ۱۲۲-۱۲۸
۳۰- مکتوب بنام پروفیسر محمد ابراہیم، ۵/ جنوری ۲۰۰۳ء

نقد واستدراک

نظم قرآن کے بارے میں
شاہ ولی اللہؒ اور مولانا مودودیؒ کے نظریات

پروفیسر سیّد احتشام احمد ندوی

تحقیقاتِ اسلامی جلد ۲۶، شمارہ ۳، ۴، جولائی - ستمبر، اکتوبر - دسمبر ۲۰۰۷ء میں جناب حافظ مبشر حسین لاہوری کا مقالہ 'تفسیر میں نظم قرآن کی استدلالی حیثیت' دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ مقالہ عالمانہ ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے نظم قرآن پر مختلف علماء کے خیالات پیش بھی کیے ہیں اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ البتہ ان کی اپنی رائے ہے کہ قرآن مجید کے بارے میں نظم کی بحث چنداں ضروری نہیں ہے۔ یوں بھی یہ بحث عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کسی عمدہ کتاب کے بارے میں یہ بحث کی جائے کہ اس میں ربط ہے اور مضامین و موضوعات میں نظم پایا جاتا ہے۔ بہر حال قدیم و جدید علماء کے درمیان یہ بحث رہی ہے اور فاضل مقالہ نگار نے اس کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریہ

یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ حافظ مبشر حسین صاحب نے اس پوری بحث میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے خیالات سے تعرّض نہیں کیا ہے۔ اس مسئلہ میں حضرت شاہ صاحب کی رائے ان کی کتاب 'الفوز الکبیر' میں ملتی ہے۔ اس موضوع پر شاہ صاحب کے خیالات سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی رقم طراز ہیں:

''قرآنیات میں فکرِ ولی اللّٰہی کا اظہار ان کی تین چار کتابوں - فتح الرحمٰن، الفوز الکبیر، فتح الخبیر اور مقدمہ در قوانین ترجمہ - میں ہوا ہے۔ شاہ صاحب کا بنیادی موقف یہ ہے کہ قرآن مجید چھوٹے چھوٹے خطبات کا مجموعہ ہے جن کو ایک سورت کے قالب میں نظم و ترتیب و حسن علاقہ کی

بنا پر گوندھ دیا گیا ہے۔ جب متعدد مجموعۂ آیات یا خطبات آ جاتے ہیں تو وہ سورت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ آیتوں کی سورتوں میں ترتیب اور سورتوں کی یکے بعد دیگرے ترتیب و تنظیم ارشاد الٰہی کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی، اس لیے وہ توقیفی تھی۔ قرآن مجید کے یہ خطبات دراصل عربوں یا معاصرین نبوی کے طریقۂ تقریر و اظہار کے مطابق تھے۔ ان میں منطقی ترتیب اور سلسلہ بہ سلسلہ دلائل کی تنظیم کا التزام نہیں کیا جاتا تھا، جیسا کہ بعد کے لکھنے والوں کا ہو گیا ہے۔ اس طریقۂ اظہار میں حکمت یہ تھی کہ وہ نافع ہو اور دل میں اُتر جائے۔ اسی نفع رسانی کی حکمت کی بنا پر قرآن مجید میں مختلف اسالیب اور ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب اور ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف التفات ملتا ہے اور ایک ہی علم کا بیان مرکزاً نہیں کیا جاتا، بلکہ پانچوں علوم قرآنی بار بار تصریف کے طریقہ سے لائے جاتے ہیں۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ پانچوں یا دو تین ترتیب سے یا یکے بعد دیگرے آئیں، بلکہ ایک خطبہ کو دوسرے خطبہ سے اور دوسرے کو تیسرے سے ایک مخصوص آہنگ کے ذریعہ پرو دیا جاتا اور وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات مضمون کی مناسبت کی بنا پر دو خطبوں کو آپس میں جوڑ دیا جاتا ہے، حالانکہ ان میں اسلوب کا فرق ہوتا ہے، لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے، اسالیب کے آہنگ کی رعایت زیادہ کی گئی ہے''۔

(حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، مصنفہ محمد یٰسین مظہر صدیقی، ۲۰۰۱ء، علی گڑھ، ص ۲۴)

شاہ ولی اللہ کے نظریۂ نظم قرآن پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی رقم طراز ہیں:

''وہ (یعنی شاہ ولی اللہؒ) قرآن کو مجموعۂ مکاتیب کے مانند تصور کرتے ہیں، چنانچہ انھوں نے 'الفوز الکبیر' میں اس کی وضاحت اس طرح کی ہے: ''قرآن مجید کو عام کتابوں کی مانند ابواب اور فصول میں اس طرح مرتب نہیں کیا گیا کہ ہر بحث الگ باب یا فصل میں بیان کر دی جاتی، بلکہ قرآن مجید کو مکاتیب کے مجموعہ کی طرح تصور کرنا چاہیے۔ جس طرح کہ بادشاہ اپنی رعایا کو وقت کی ضرورت کے لحاظ سے کوئی فرمان جاری کرتا ہے، پھر دوسرا اور تیسرا فرمان لکھتا ہے، یہاں تک کہ بہت سے فرامین جمع ہو جاتے ہیں اور کوئی شخص ان کو جمع کر کے ایک مجموعہ مرتب کر دیتا ہے۔ اسی طرح شہنشاہِ مطلق نے بندوں کی ہدایت کے لیے رسول اللہ ﷺ پر

حسبِ ضرورت قرآن مجید کی سورتیں یکے بعد دیگرے نازل فرمائیں۔ نبی ﷺ کے زمانہ میں ہر سورت جداگانہ مرتب ومحفوظ تھی۔ آپ نے ان کو مدوّن نہیں فرمایا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک جلد میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کردی گئیں'' (الفوز الکبیر، ص ۴۷)

(حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی قرآنی فکر کا مطالعہ از مولانا محمد سعود عالم قاسمی، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۶)

یہاں پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی اور اور پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی کے بیانات میں کسی قدر اختلاف ہے، لیکن اس سے بہر حال قرآن کے نظم پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔ محترم مبشر حسن نے اپنے مضمون میں شاہ صاحب کا ذکر نہیں کیا ہے۔

مولانا مودودیؒ کا نظریہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس نقطۂ نظر کو زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد اول کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:

''ایک اور وجہ، اور بڑی اہم وجہ لفظی ترجمے کے غیر مؤثر ہونے کی یہ ہے کہ قرآن کا طرزِ بیان تحریری نہیں، بلکہ تقریری ہے۔ اگر اس کو منتقل کرتے وقت تقریر کی زبان کو تحریر کی زبان میں تبدیل نہ کیا جائے اور جوں کا توں اس کا ترجمہ کر ڈالا جائے تو ساری عبارت غیر مربوط ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید ابتداءً لکھے ہوئے رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیا گیا تھا، بلکہ دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں حسبِ موقع وضرورت ایک تقریر نبی ﷺ پر نازل کی جاتی تھی اور آپ اسے ایک خطبے کی شکل میں لوگوں کو سُناتے تھے۔ تقریر کی زبان اور تحریر کی زبان میں فطرۃً بہت بڑا فرق ہوتا ہے، مثلاً تحریر میں ایک شبہ کو بیان کر کے اسے رفع کیا جاتا ہے، مگر تقریر میں شبہ کرنے والے خود سامنے موجود ہوتے ہیں، اس لیے بسا اوقات یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی ہے: ''لوگ ایسا کہتے ہیں''، بلکہ مقرر آمدِ سخن ہی میں ایک فقرہ ایسا کہہ جاتا ہے جو ان کے شبہ کا جواب ہوتا ہے۔ تحریر میں سلسلۂ کلام سے الگ مگر اس سے قریبی تعلق رکھنے والی کوئی بات کہنی ہو تو اس کو جملۂ معترضہ کے طور پر کسی نہ کسی طرح عبارت سے جدا کر کے لکھا جاتا ہے، تاکہ ربطِ کلام ٹوٹنے نہ پائے۔ لیکن تقریر میں صرف لہجہ اور طرزِ

خطاب بدل کر ایک مقرر بڑے بڑے جملہ ہائے معترضہ بولتا چلا جاتا ہے اور کوئی بے ربطی محسوس نہیں ہوتی۔ تحریر میں بیان کا تعلق ماحول سے جوڑنے کے لیے الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن تقریر میں ماحول خود ہی بیان سے اپنا تعلق جوڑ لیتا ہے اور ماحول کی طرف اشارہ کیے بغیر جو باتیں کہی جاتی ہیں، ان کے درمیان کوئی خلا محسوس نہیں ہوتا۔ تقریر میں متکلّم اور مخاطب بار بار بدلتے ہیں۔ مقرر اپنے زورِ کلام میں موقع و محل کے لحاظ سے کبھی ایک ہی گروہ کا ذکر بصیغۂ غائب کرتا ہے اور کبھی اسے حاضر سمجھ کر براہ راست خطاب کرتا ہے۔ کبھی واحد کا صیغہ بولتا ہے اور کبھی جمع کے صیغے استعمال کرنے لگتا ہے۔ کبھی متکلم وہ خود ہوتا ہے، کبھی کسی گروہ کی طرف سے بولتا ہے، کبھی کسی بالائی طاقت کی نمائندگی کرنے لگتا ہے اور کبھی وہ بالائی طاقت خود اس کی زبان سے بولنے لگتی ہے۔ تقریر میں یہ چیز ایک حُسن پیدا کرتی ہے، مگر تحریر میں آ کر یہی چیز بے جوڑ ہو جاتی ہے۔ یہی وجوہ ہیں کہ جب کسی تقریر کو تحریر کی شکل میں لایا جاتا ہے تو اس کو پڑھتے وقت آدمی لازماً ایک طرح کی بے ربطی محسوس کرتا ہے اور یہ احساس اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے جتنا اصل تقریر کے حالات اور ماحول سے آدمی دور ہوتا جاتا ہے۔ خود قرآنِ عربی میں بھی ناواقف لوگ جس بے ربطی کی شکایت کرتے ہیں، اس کی اصلیت یہی ہے۔ وہاں تو اُس کو دور کرنے کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ تفسیری حواشی کے ذریعہ سے ربطِ کلام کو واضح کیا جائے، کیونکہ قرآن کی اصل عبارت میں کوئی کمی بیشی کرنا حرام ہے۔ لیکن کسی دوسری زبان میں قرآن کی ترجمانی کرتے ہوئے اگر تقریری کی زبان کو احتیاط کے ساتھ تحریر کی زبان میں تبدیل کر لیا جائے، تو بڑی آسانی کے ساتھ یہ بے ربطی دور ہو سکتی ہے۔''

(ملاحظہ ہو تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، جلد اول، ص ۸-۹)

مولانا مودودیؒ نے جو عالمانہ افکار پیش کیے ہیں اور قرآن مجید کی تقریری زبان اور اسلوب کو جس طرح پیش کیا ہے وہ مولانا حمید الدین فراہی کے نظم قرآن سے بالکل مختلف ہے، بلکہ اس سے ایک طرح سے اس کی تردید ہوتی ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ جیسے عباقرۂ قرآنیات کے نظریات سے بالکل تعرض نہیں کیا ہے۔ اس سے مقالہ میں ایک طرح کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔

تعارف وتبصرہ

سنّتوں کا تنوّع - ہر سنّتِ نبوی افضل ہے پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

ناشر: ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، صفحات: ۱۹۵، قیمت: ۱۲۵ روپے، سنہ اشاعت: درج نہیں

صحابہ کرامؓ اللہ کے رسول ﷺ کے براہ راست فیض یافتہ تھے۔ انھوں نے آپؐ سے مختلف اوقات میں مختلف ارشادات سنے اور آپؐ کو مختلف اعمال کرتے ہوئے دیکھا۔ جس صحابی نے آپ ﷺ کو جس طرح دیکھا اور سنا وہ اُسی پر تاحیات قائم رہا اور اپنے شاگردوں کو بھی اسی کی تعلیم وتلقین کی۔ اس بنیاد پر مختلف فقہی مسالک وجود میں آئے۔ ہر مسلک کی بنیاد رسول اللہ ﷺ سے مروی کسی قول یا فعل پر تھی۔ مگر بدقسمتی سے یہ فقہی اختلاف اپنی حدود سے نکل کر باہم رسہ کشی، حسد، بغض اور افتراق امت کی وجہ بنا، جس کا کوئی جواز نہ تھا۔ امت کے اختلاف وانتشار کو محدود یا ختم کرنے کی ایک تدبیر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مختلف سنتوں کو نمایاں کیا جائے۔ زیر نظر کتاب اس ضرورت کو بخوبی پوری کرتی ہے۔ محترم مصنف مدظلہ العالی کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''رسول اکرمؐ نے کبھی ایک وجہِ سنت پر عمل فرمایا یا ایک جہت حدیث بیان فرمائی اور کبھی دوسری۔ بسا اوقات ان کی کئی کئی وجوہِ جہات ملتی ہیں۔ اور نہ صرف ان رنگارنگ سنتوں پر بنفس نفیس عمل فرمایا، بلکہ ان ہی کی تعلیم صحابۂ کرام کو الگ الگ دی، کسی کو ایک وجہ سنت سکھائی اور کسی کو دوسری، اور کسی اور صحابی کو تیسری، اور بسا اوقات یہ تعداد دس بارہ سے بھی تجاوز کر گئی۔ ہر صحابی نے اپنی سیکھی ہوئی سنت پر عمل کیا اور دوسرے صحابہ کو وہی سکھائی اور دوسرے مسلمانوں اور شاگردوں کو اسی خاص سنت کی تعلیم دی .....روایت ودرایت کے اعتبار سے کس کا کیا پایہ ہے اس کا تعلق فن حدیث وسنت سے ہے اور خالص تکنیکی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی ہر ثابت شدہ حدیث وسنت نہ صرف ہم پلہ، ہم سر ہے بلکہ ہر ایک افضل واصح وصحیح ترین ہے، صرف اس بنا پر کہ وہ سنت نبوی ہے'' (ص-۹)

آگے نماز کی ان متنوع سنتوں کے بارے میں جو فقہی مسالک کے درمیان وجہ نزاع بن گئی ہیں، لکھتے ہیں: ''ان میں تفرقہ بازی زیادہ کی جاتی ہے۔ اپنی پسندیدہ یا مختار

وجہ سنت کو واحد مستقل سنت بتایا جاتا ہے اور دوسرے یا دوسروں کی پسندیدہ یا مختار سنتوں کو ہر طرح سے کم زور، ضعیف، اعتبار سے ساقط، نا قابل عمل حتی کہ غلط بتایا جاتا ہے۔ یہ علمی یا اسلامی انداز فکر ہے اور نہ حدیثی تشریح وتعبیر۔ یہ خالص مسلکی جارحیت اور فقہی عصبیت ہے جو مردود ہے'' (ص ۱۰)

ان اقتباسات سے یہ بات بالکل عیاں ہوجاتی ہے کہ مصنف مدظلہ دراصل امت کے درمیان مسلکی خلیج کو پاٹنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کتاب میں تقریباً ان تمام مسائل سے بحث کی ہے جو کسی بھی طرح بین المسالک وجہِ نزاع بنے ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے کتاب بہت اہم اور اسلامیات میں اپنی نوعیت کی منفرد کوشش ہے۔

کتاب کو مقدمہ اور تمہید کے بعد دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصّے میں مختلف سنتوں کا تنوع دکھایا گیا، جو روزمرہ کی مختلف عبادات سے متعلق ہیں، جیسے طہارت، نماز۔ نماز کی متنوع سنتوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے، اس لیے کہ بقول مصنف محترم ''ان ہی میں تفرقہ بازی زیادہ کی جاتی ہے''۔ (ص ۱۰)۔ دیگر عبادات میں زکوٰۃ، صدقہ، روزہ، حج، عمرہ اور دوسری متنوع سنتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ جو اصولی مباحث پر مشتمل ہے، بہت اہم ہے۔ اس میں مختلف سنتوں کی اصل اور اس کی جہات سے تعرض کیا گیا ہے۔ اسی طرح مستقل وواحد سنت، عادی اور تعبّدی سنتوں کی تقسیم، مختلف ومتنوع سنتوں کی تعلیم نبوی، نماز کی نوع بہ نوع سنتوں کی تعلیم، اس کی تاریخی وتوقیتی حیثیت، صحابہ کرامؓ کو سنن کی تعلیم، تابعین سے مجتہدین تک سنن کا بہاؤ اور تسلسل، مراکز سنت، راجح اور مرجوح کا مسئلہ، قولی وفعلی حدیث کا فرق واطلاق، اقرب الی السنۃ کا تصور ونظریہ، مختلف سنن کی تطبیق کا اصول واطلاق، سنت کا اجر وثواب اور افضلیت سنت پر بحث کے علاوہ کئی اور اہم موضوعات پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود فاضل مصنف کے تمام نتائجِ بحث سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱- فاضل مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے:

''بعض اہل علم بلا سوچے سمجھے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیات کریمہ کی مانند احادیث نبوی قطعی دلالت نہیں رکھتی ہیں۔ ان کے بارے میں ظن وگمان رہتا ہے کہ قطعی طور پر ثابت ہیں یا نہیں۔ اسی بنا پر ان کو ظنی الدلالۃ کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں۔ بلاشبہ وہ احادیث جن کی صحت پر اتفاق نہیں وہ ظنی الدلالۃ ہیں، لیکن جو مسلّمہ اور ثابت شدہ احادیث ہیں وہ قطعی الدلالۃ ہیں''۔ (۱۸-۱۹)

اس عبارت میں خلط مبحث ہوگیا ہے۔ بحث قطعی الثبوت اور ظنی الثبوت کی چل رہی ہے، لیکن فاضل مصنف نے سبقتِ قلم سے قطعی الدلالۃ اور ظنی الدلالۃ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

۲- 'نماز کے بعد کے اذکار' کے اس ضمن میں ۷ اقسم کے اذکار درج کیے گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ نماز کے بعد گیارہ گیارہ مرتبہ سبحان اللہ، الحمدللہ، اللہ اکبر کہنا چاہیے (ص ۷۳)۔ گیارہ مرتبہ کی روایات کے بارے میں علامہ ابن قیمؒ نے اپنی مشہور کتاب زادالمعاد (۱/ ۲۹۹-۳۰۰) میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کی رائے ہے کہ یہ راویوں کا تصرف ہے۔ خاص کر ابوصالح کا جو حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ہیں۔ حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں: ''**یسبّحون و یحمدون ویکبّرون دبر کل صلاۃ ثلاثا و ثلاثین**''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر کلمہ ۳۳ بار پڑھا جائے، مگر ابوصالح نے ان الفاظ سے یہ بات سمجھ لی کہ ہر کلمہ گیارہ گیارہ مرتبہ پڑھا جائے، تاکہ کل ملا کر ان کی تعداد ۳۳ ہوجائے۔ صحیح مسلم میں یہ روایت دو طرق سے آئی ہے۔ ایک حضرت قتیبہ کے واسطے سے اور دوسری حضرت عاصم بن نصر التیمی کے واسطے سے۔ اس روایت میں ابوصالح کے شاگرد سمیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بعض عزیزوں کے سامنے اس حدیث کا تذکرہ کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ تجھے وہم ہوگیا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے تو یہ فرمایا ہے کہ ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۳ مرتبہ اللہ اکبر کے کلمات کہو۔ (صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ: ۱۳۴۷) علامہ نووی شارح مسلم فرماتے ہیں کہ

امام مسلم نے اس حدیثِ ابوصالح کے بعد دوسرے طرق سے جو حدیثیں نقل کی ہیں ان میں صراحت ہے کہ ہر کلمہ ۳۳ بار پڑھا جائے، اس کے ظاہری معنیٰ یہی ہیں کہ ان کے نزدیک اس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ ہر ایک کلمہ ۳۳ بار پڑھا جائے (اس کے بعد) قاضی عیاض کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ یہ تاویل ابوصالح کی تاویل سے اعلیٰ وافضل ہے۔ (شرح النووی ج:۲، جز:۵، ص۹۳/۹۴)۔

۳- فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ ''اہل سیر کی ایک بڑی تعداد اور محدثین کی ایک معتبر جماعت کے مطابق آپ ﷺ نے اپنی نبوت کے بعد بھی متعدد ورنہ کم از کم دو حج ضرور ادا فرمائے (ص:۱۰۷) اس بات کے لیے جو حوالے دیے گئے ہیں ان میں سے کسی میں آں حضرت ﷺ کے دو حج کرنے کی صراحت نہیں ہے، جب کہ دیگر روایات میں صراحت کے ساتھ مذکورہ ہے کہ آپؐ نے چار عمرے اور ایک حج ادا فرمایا۔ (ملاحظہ کیجیے، صحیح بخاری، کتاب الحج، ابواب العمرۃ، باب کم اعتمر النبی ﷺ: ۱۷۷۸، ۱۷۷۹، ۱۷۸۰، صحیح مسلم، کتاب الحج، باب بیان عدد عمر النبی ﷺ و زمانہن: ۳۰۳۳، ۳۰۳۴)۔

۴- ایک جگہ مصنف گرامی نے تحریر فرمایا ہے: ''قربانی کا گوشت تقسیم کرنا یا سب کھا لینا بھی سنت ہے (ص۱۱۴)۔ یہ بات محلِ نظر ہے۔ سنت اور جواز میں فرق کیا جانا چاہیے۔ قربانی کرنے والا پورا گوشت اپنے استعمال میں لے آئے تو کوئی حرج نہیں، لیکن اس کو سنت قرار دینا صحیح نہیں۔ سنت اس عمل کو کہا جاتا ہے جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے دینی حیثیت سے عمل کیا ہو۔ اس عبارت کے ذیل میں فاضل مصنف نے بخاری/ فتح الباری، کتاب الاطعمۃ کا حوالہ دیا ہے، مگر ان میں پورا گوشت کھانے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ امام بخاری نے یہ روایت درج کی ہے ''**وان کنا لنرفع الکراع فنأ کله بعد خمس وعشرة**'' (**عن عائشة، کتاب الأطعمة، باب ماکان السلف یدّخرون فی بیوتهم وأسفارهم من الطعام واللحم وغیره**: ۵۴۲۳) حضرت ابن حجر عسقلانیؒ نے اپنی شرح بخاری میں اس حدیث کی شرح میں جو احادیث درج کی ہیں ان میں بھی صرف کھانے اور زاد راہ کے طور استعمال کرنے کا ذکر ہے، نہ کہ پورا

کھانے کا۔ ’’کنا لانأکل من لحوم بدننا فوق ثلاث، فرخّص لنا النبیؐ فقال: کلوا وتزوّدوا‘‘ (فتح الباری، ۹/۵۵۳۔) ہم تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت نہیں کھاتے تھے، پھر نبیؐ نے ہمیں رخصت دے کر فرمایا: کھاؤ اور زادراہ کے طور پر بھی استعمال کرو۔) ایک روایتِ بخاری میں بھی اس کی صراحت ہے: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں، ہم نبی کریمؐ کے عہد میں قربانی کے گوشت کو مدینے تک زادِ راہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ (حوالہ سابق، بخاری، ۵۴۲۴)۔

۵- فاضل مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے: ’’متعدد صحابۂ کرام نے عہد نبوی اور عہد خلافت میں سونے کی انگوٹھی کا استعمال بلا کراہت جاری رکھا‘‘ (ص ۱۱۶) یہاں انھوں نے اس بات کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، البتہ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: ’’حضرت براء بن عازبؓ خزرجی کو رسول اکرم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے سونے کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ صحابۂ کرام کے اعتراض اور کراہت طلاء بتانے کے باوجود انھوں نے وہ انگوٹھی تا زندگی ہاتھ سے نہیں اُتاری، ہر سوال کے جواب میں فرماتے تھے کہ اسے کیوں کر اتاروں؟ میرے رسول مکرم ﷺ نے مجھے بطور خاص پہنائی تھی‘‘ (ص ۱۴۲)۔ جہاں تک مردوں کے لیے سونے کے استعمال کا معاملہ ہے اس کی حرمت وممانعت متعدد صحابۂ کرام سے مروی احادیث نبوی سے ثابت ہے۔ ان صحابۂ کرام میں حضرت براء بن عازبؓ بھی ہیں۔ (ملاحظہ کیجیے صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب خواتیم الذھب: ۵۸۶۳)۔ رہی حضرت براء بن عازبؓ سے مروی درج بالا روایت تو علامہ ابن حجرؒ نے اس پر مفصل بحث کی ہے اور علامہ حازمی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کی سند قوی نہیں ہے۔ اور اگر صحیح بھی ہو تو منسوخ ہے۔ (فتح الباری، ۱۰/ ۳۱۷)۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حلّت اور حرمت کی دونوں روایتیں حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہیں۔ حلّت کی روایت فعلی ہے اور حرمت کی روایت قولی۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ قولی حدیث کو فعلی حدیث پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ (جس کے مصنف قائل نہیں ہیں۔ ملاحظہ ہو مذکورہ کتاب: ۱۶۱، راجح/ترجیح کا ایک اور اصول حدیث)۔ دوسرا اصول یہ ہے ’اذا اجتمع الحلال والحرام

غلب الحرام‘ (جب حلال اور حرام (کسی شرعی مسئلے میں ایک ساتھ) جمع ہوجائیں تو حرام کو ترجیح حاصل ہوگی)۔ انھوں نے حلّت پر دلالت کرنے والا واقعہ تو نقل کردیا، مگر نہ تو ان روایات کا تذکرہ کیا جن میں صراحت کے ساتھ ممانعت آئی ہے اور نہ حلّت والی روایت پر محدثین نے جو کلام کیا ہے اس سے تعرّض کیا۔ فاضل گرامی نے حضرت براء بن عازبؓ کو خزرجی لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے، وہ اوسی ہیں۔ دیکھیے اسد الغابۃ لابن الاثیر، ۱/ ۲۰۵، مکتبہ ابن تیمیہ قاہرہ۔) البتہ ایک دوسرے صحابی حضرت براء بن مالکؓ خزرجی ہیں جو حضرت انس بن مالکؓ کے بھائی تھے۔ (حوالہ بالا، ص ۲۰۶)

بعض اور بھی چھوٹی موٹی باتیں توجہ طلب ہیں۔ مثلاً اوقاتِ نماز کے بعد خاص نماز کی سنتوں کے زیرعنوان سب سے پہلے تکبیر تحریمہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ تکبیر تحریمہ بالاتفاق فرض ہے۔ یہاں تکبیر تحریمہ کے بجائے ’رفع یدین‘ کا لفظ استعمال کیا جانا مناسب تھا۔ اقامت کے سلسلے میں بھی مختلف اقوال رسول ہیں۔ اُن کا بھی تذکرہ مناسب تھا، مگر نہ معلوم کیوں مصنف محترم نے اس مسئلے کو نظرانداز کردیا۔ مولانا محمد یوسف بنّوریؒ کی شرح سنن ترمذی کا نام معارف السنن اور علامہ خطابیؒ کی شرح سنن ابی داؤد کا نام معالم السنن ہے۔ ص ۳۰ پر دونوں کتابوں کے حوالے مذکور ہیں۔ مگر ص ۱۰۲ پر غلطی سے مولانا بنوری کی شرح کا نام معالم السنن درج ہوگیا ہے۔

اس طرح کی بعض تحقیق طلب باتوں کے باوجود یہ کتاب مختلف الخیال لوگوں کے درمیان پُل (bridge) کا کام دے سکتی ہے اور ایک دوسرے کو قبول اور گوارا کرنے کا جذبہ پیدا کرسکتی ہے۔

امید ہے کہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور کُھلے دل سے اس کا مطالعہ کیا جائے گا۔

(مجاہد شبیر احمد فلاحی)

تعمیر معاشرہ اور مساجد — مولانا امیر الدین مہر

ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، صفحات: ۱۹۶، قیمت: ۶۵ روپے۔

مساجد کی حیثیت مسلم معاشرہ کے مرکز اور دین کے ترجمان کی ہے۔ یہیں سے

امت کو رشد و ہدایت کی روشنی ملتی اور حق و باطل کا علم ہوتا ہے۔ اسی کے منبر و محراب سے اللہ کا کلمہ بلند کیا جاتا اور شیاطین و دشمنان اسلام کی سازشوں سے بچنے کی تدابیر بتائی جاتی ہیں۔ خیر القرون میں مساجد کی امامت اور خلافت و سیادت کو ایک سمجھا جاتا تھا اور دونوں کے درمیان علاحدگی کا کوئی تصور نہ تھا۔ جب سے یہ رشتہ متاثر ہوا ہے، امت اجتماعی مرکزِ قیادت سے محروم ہوگئی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مساجد کے حقیقی کردار کو بحال کیا جائے اور انھیں اصلاح معاشرہ کا مرکز بنایا جائے۔ یہ ہے وہ مرکزی موضوع جس پر زیرِ نظر کتاب کے مباحث مبنی ہیں۔

یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے۔ اولین دو ابواب (کتاب اللہ اور مسجد، رسول اللہ ﷺ اور مسجد) میں قرآن و حدیث کی روشنی میں مسجد کے حقیقی کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے باب کا عنوان ہے 'صحابہ کرامؓ اور مسجد'۔ اس میں تعمیر مساجد سے صحابہ کرامؓ کا شغف، خانۂ کعبہ، مسجد نبوی اور مسجد قبا کی تعمیر میں اُن کا حصہ لینا، دن رات کے اکثر اوقات مسجد میں گزارنا، تعلیم و تعلم، ذکر و وعظ، جہاد کی تیاری، اہم فیصلوں کا اعلان مسجد میں ہونا اور عہدِ صحابہؓ میں مساجد کی تعمیر و توسیع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب چہارم (خیر القرون میں مساجد) میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی دعوت کا مرکز مسجد کو بنایا تھا۔ چنانچہ ہجرتِ مدینہ کے بعد آپؐ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسجد تعمیر کی۔ یہ مسجد مسلمانوں کے جملہ معاشرتی و معاشی اور سیاسی و سماجی معاملات کا مرکز تھی۔ نبی ﷺ کی نشست اور عدالت، وفود کا قیام، اصحاب صفہ کی رہائش، ذکر و تعلیم کے حلقے، زخمیوں کی مرہم پٹی، جہاد کی تیاری، رائے و مشورہ اور فقراء و مساکین کے لیے چندہ، غرض جملہ اجتماعی کام مسجد میں انجام پاتے تھے۔ بعد کے زمانے میں متعدد خلفا اور مشہور ائمہ مساجد ہی میں اپنے حلقہ ہائے درس قائم کرتے تھے۔ خیر القرون میں مساجد نماز اور ذکر و تلاوت کے علاوہ اصلاحی و رفاہی کاموں کا بھی مرکز ہوتی تھیں۔ ان میں شفا خانے اور کتب خانے وغیرہ کا بھی انتظام ہوتا تھا۔ باب پنجم میں بتایا گیا ہے کہ مساجد میں باجماعت نماز کی ادائی سے مسلمانوں میں تعلق باللہ، اطاعت کا جذبہ، ادائیِ فرائض کی

تربیت، انشراح قلب، اجتماعی ومعاشرتی مسائل کا ادراک، منشیات ومکروہات سے پرہیز، نیز عوام سے رابطہ رکھنے کی صفات پروان چڑھنی چاہیے۔

باب ششم کا عنوان ہے 'دور حاضر میں مسجد کے حقیقی کردار کی بحالی'۔ اس باب میں فاضل مصنف نے بار بار زور دیا ہے کہ مسجد مسلمانوں کے معاشرتی اور سیاسی معاملات کا مرکز ہے، اس لیے یہاں سے اِنھیں اِن معاملات میں رہنمائی ملنی چاہیے، اس کے بغیر تعمیر معاشرہ کا کام نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا۔ اس لیے مساجد میں خطبۂ جمعہ کے علاوہ دروس قرآن وحدیث، تعلیم بالغان اور خصوصی اجتماعات کا اہتمام کیا جائے۔ نیز اِن میں دارالمطالعہ، کتب خانہ، ابتدائی علاج معالجہ، تجہیز وتکفین، تصفیۂ تنازعات، نکاح خوانی، مہمان خانہ ومسافر خانہ اور دیگر رفاہی کاموں کا ایسا نظم کیا جائے کہ عوام ازخود مسجد سے جڑ جائیں۔

باب ہفتم میں 'مساجد کی تعمیر اور ان کا انتظام' کے عنوان سے امام، مؤذن، متولی اور خدامِ مسجد کی اہمیت وشرائط، ان کی ذمہ داریوں اور حقوق، اور اذان ومسجد کے آداب وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ باب ہشتم (چند مساجد عالم) میں دنیا کی مشہور اور تاریخی مساجد کا مختصر تعارف ہے۔

کتاب کا آخری باب 'مسجد کے کردار کے خلاف کشمکش' بھی اہم ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے بیان کیا ہے کہ آج مساجد کا حقیقی کردار مفقود ہو چکا ہے، اب ان کی وہ مرکزیت باقی نہ رہی جو خیر القرون میں تھی۔ اس کے بنیادی طور پر دو اسباب بیان کیے ہیں، ایک بیرونی دوسرا اندرونی۔ بیرونی اسباب میں یہود، نصاریٰ، مشرکین، منافقین، کمیونسٹوں، سوشلسٹوں اور تاتاریوں کی اسلام دشمن کارروائیوں اور بالخصوص مساجد کی پامالی اور بے حرمتی، اور اندرونی اسباب میں خود مسلمانوں کی مساجد سے بے توجہی، بے جا مصنوعی تقدس، مساجد کو صرف نمازوں تک محدود کر دینا اور امام وموذن کا معاشرہ کے بے اثر طبقے سے ہونا شمار کرایا ہے۔

مصنف کتاب مولانا امیر الدین مہر کی مسجد سے وابستگی بہت قدیم اور گہری ہے۔ تقریباً پچاس سال تک وہ امامت و خطابت اور درس و تدریس سے متعلق رہے ہیں۔

ان دنوں دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سے قبل آپ کی ایک مختصر کتاب 'دعوت وتبلیغ میں مسجد کا کردار' متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔

پیشِ نظر کتاب کافی تحقیق ومطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے، لیکن مصنف نے اکثر مقامات پر کتب مراجع خصوصاً کتب احادیث کا صرف نام دیا ہے، مکمل حوالہ نہیں دیا ہے۔ اگر حوالہ کا عصری طریقہ اختیار کیا جاتا تو کتاب کی اہمیت واستناد میں اضافہ ہوتا۔ ص ۵۵ تا ۵۶ پر انھوں نے اسد الغابہ سے حضرت بلالؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ وفات نبوی کے بعد وہ شام چلے گئے تھے۔ پانچ چھ سال بعد ایک مرتبہ وہاں سے مدینہ آئے تو صحابہؓ کی فرمائش پر ایک دن فجر کی اذان دی۔ ان کی اذان سن کر اہلِ مدینہ میں کھلبلی مچ گئی، یہاں تک کہ عورتیں تک گھروں سے نکل پڑیں اور گریہ وبکا کرنے لگیں۔ تحقیقی اعتبار سے یہ واقعہ ثابت نہیں ہے۔ مشہور محدث اور سیرت نگار حافظ ابن کثیرؒ نے حضرت بلالؓ کے تذکرہ میں اس واقعہ کو بیان کر کے اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (البدایۃ والنہایۃ، حافظ ابن کثیر، دار الریان للتراث، مصر ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء، ۷/۱۰۴)

ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ: ''ابتدا میں امام خطبۂ جمعہ کے وقت ایک ہاتھ میں تلوار تھامے رکھتا تھا'' (ص ۸۰)۔ یہ خیال محتاج ثبوت ہے۔ امام ابن قیمؒ اس کی نکیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''نبی ﷺ سے ہاتھ میں صرف عصا یا قوس لے کر خطبہ دینا ثابت ہے۔ خطبۂ جمعہ کی حالت میں تلوار ساتھ رکھنے کی بات جہلاء کا من گھڑت خیال ہے، جو صحیح نہیں''۔ (زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، بیروت، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء، جلد ۱، ص ۱۸۹-۱۹۰)

اس طرح کی بعض تحقیق طلب بحثوں سے قطع نظر فاضل مصنف کی یہ علمی کاوش قابل تحسین ہے۔ کتاب اس لائق ہے کہ اسے مساجد کے ائمہ، موذنین اور متولی حضرات تک پہونچایا جائے اور زیادہ سے زیادہ اس کی اشاعت ہو۔ اصلاح معاشرہ اور دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے بھی یہ مفید ہے۔

(سراج احمد برکت اللہ فلاحی)

عصر حاضر میں اسوۂ رسول کی معنویت　　پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

ناشر: فیکلٹی دینیات، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، ۲۰۰۸ء، صفحات: ۱۹۲، قیمت درج نہیں۔

سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی تمام زبانوں میں قابل قدر لٹریچر موجود ہے اور آئے دن اس میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سلسلۃ الذہب میں شامل ہونا باعث سعادت ہے۔ زیرِ نظر کتاب بھی اس موضوع پر ایک خوب صورت اضافہ ہے۔

یہ کتاب گیارہ مقالات پر مشتمل ہے، جو اگر چہ مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں، لیکن سب میں ایک ہی روح کارفرما ہے۔ ان میں عصر حاضر کے پس منظر میں اسوۂ رسول کی معنویت آشکارا کی گئی ہے۔ ابتدائی تین مقالات کا خطاب امت مسلمہ سے ہے۔ پہلے مقالے میں واضح کیا گیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کا مابہ الامتیاز وصف انسانوں کی خدمت ہے۔ آپؐ نے نہ صرف یہ کہ اپنے ارشادات کے ذریعہ اس کی تلقین کی، بلکہ خود بھی اس پر عمل کر کے دکھایا۔ دوسرے مقالے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اسوۂ رسول کی روشنی میں آج کے مسلمانوں کو قلم اور کردار سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ تیسرے مقالہ کا عنوان ہے 'ہجرت حبشہ۔ مسلم اقلیت کے لیے اسوۂ' اس میں مسلمانانِ حبشہ کے احوال تفصیل سے بیان کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ آج ان ممالک میں جہاں حکومت اور اکثریت دوسرے مذاہب کے حاملین کی ہے اور مسلمان وہاں اقلیت کی حیثیت سے جی رہے ہیں، مہاجرین حبشہ کے حالات سے رہ نمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ماحول کا تحفظ، شہری منصوبہ بندی اور امن عالم عالمی سطح پر موجودہ دور کے سنگین مسائل ہیں۔ دنیا کے دانش ور انھیں حل کرنے میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ تین مقالات میں الگ الگ ان مسائل سے بحث کی گئی ہے اور واقعات سیرت کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے بہت کامیابی کے ساتھ ان مسائل کو حل کیا تھا۔ اور آپ کا اسوہ اختیار کر کے آج بھی انھیں بہ خوبی حل کیا جاسکتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل برصغیر کے ایک مسلم دانش ور نے دعویٰ کیا تھا کہ ''اسوۂ رسول ﷺ اسوۂ حسنہ تو ہے، مگر اسوۂ کاملہ نہیں ہے، چنانچہ بعض پہلوؤں سے آج کے دور میں محمدی ماڈل کے بجائے مسیحی ماڈل

قابلِ انطباق ہے''۔ایک مقالہ میں اس دعوی کا تعاقب کیا گیا ہے اور بہ دلائل ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کا اسوہ، اسوۂ حسنہ بھی ہے اور اسوۂ کاملہ بھی۔اسی طرح ایک صاحب نے یہ خیالِ خام پیش کیا تھا کہ ''اخروی نجات کے لیے آج کے دور میں رسالت محمدیؐ پر ایمان لانا ضروری نہیں، دوسری امتوں کے صالحین بھی اس کے مستحق ہیں''۔ایک مقالہ میں اس خیال کا ابطال کیا گیا ہے۔دو مقالات سیرت محمدی کے خلاف مغربی رویہ کا محاسبہ کرتے ہیں اور آخری مقالہ میں اہل ایمان کو دعوت فکر و عمل دی گئی ہے۔یہ تمام مقالات موجودہ دور کے اہم مسائل سے بحث کرتے ہیں۔فاضل مصنف نے موثر اسلوب اور قوی دلائل کے ساتھ ان کا تجزیہ کیا ہے اور ان کے سلسلے میں آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے اسوہ کی معنویت واضح کی ہے۔ان کا کہنا بجا ہے کہ ''ان مقالات میں روح عقیدت کے ساتھ علم و استدلال کی اثر انگیزی بھی ہے''۔(ص ۱۷)

کتاب کی پروف ریڈنگ توجہ سے نہیں کی گئی ہے۔ پروف ریڈنگ میں بے توجہی یا ثانوی مراجع پر انحصار کی وجہ سے بہت سے مقامات پر الفاظ احادیث تبدیل ہوگئے ہیں۔مثلاً ص ۱۲۴ پر ترمذی کی یہ حدیث درج ہے: **اللھم انی اعوذ بک من ان نظلم او نظلم او نجھل او یجھل** جب کہ حدیث کے صحیح الفاظ یہ ہیں **اللھم انا نعوذ بک من ان نزلّ او نضلّ او نظلم او نظلم او نجھل او یجھل علینا**'' ۔(کتاب الدعوات، ۳۴۲۷) یہی معاملہ صفحات: ۵۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۱۰۲، ۱۰۳ پر درج احادیث کا ہے۔ بعض مقامات پر احادیث یا عربی عبارتوں کا صحیح ترجمہ نہیں ہوسکا ہے، مثلاً حدیث **من سکن البادیة جفا** کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے ''جس نے بدوی رہائش اختیار کی اس نے زیادتی کی'' (ص ۹۳) اس کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا: ''دیہات میں رہنے والوں کے مزاج میں درشتی ہوتی ہے''۔ہجرت حبشہ کی تفصیلات کے ضمن میں نجاشی کے اس سوال پر کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں تمھارا کیا عقیدہ ہے؟ حضرت جعفر نے جواب دیا ''وہ اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اور اس کا کلمہ تھے جسے کنواری مریم پر اللہ نے القا کیا تھا'' آگے لکھا ہے: ''نجاشی نے یہ سن کر زمین سے ایک لکڑی اٹھائی اور کہا: جو تم نے کہا ہے حضرت عیسیٰ اس سے اس لکڑی

کے برابر بھی مختلف نہ تھے (ص ۶۲) سیرت ابن ہشام کی اصل عبارت یہ ہے: **فضرب النجاشی بیدہ الی الارض فاخذ منھا عوداً ثم قال واللہ ما عدا عیسیٰ ابن مریم ما قلت ھذا** -'عود' کا ترجمہ 'لکڑی' کرنے کی وجہ سے عبارت کا سارا حسن غارت اور قول نجاشی کی ساری بلاغت فنا ہوگئی ہے۔ عود کا ترجمہ 'تنکا' کرنا چاہیے۔ علامہ شبلی نعمانی (سیرۃ النبی اول ص ۲۳۹) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (سیرت سرورِ عالم دوم ص ۴۸۱) مولانا ابوالحسن علی ندوی (نبی رحمت اول ص ۱۳۶) پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی (مکی اسوۂ نبوی ص ۱۰۶) اور دیگر مؤلفین سیرت نے یہی ترجمہ کیا ہے۔

یہ کتاب عصری اہمیت کے حامل مسائل وافکار سے بہت موثر اور مدلل انداز میں بحث کرتی ہے۔ امید ہے، اس کو قبول عام حاصل ہوگا اور اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جائے گا۔

(محمد رضی الاسلام ندوی)

کاروانِ رفتگان — مولانا مجیب اللہ ندویؒ

ناشر: ندوۃ التالیف والترجمۃ، جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء، صفحات: ۲۷۲، قیمت -/۲۰۰ روپے

زیرِ نظر کتاب ان تاثراتی تحریروں کا مجموعہ ہے جو مختلف شخصیات کی وفات پر مولانا مجیب اللہ ندوی (م ۲۰۰۶ء) کے قلم سے نکلیں اور موقر مجلّہ ماہ نامہ الرشاد میں شائع ہوئیں۔ مولانا مرحوم کا شمار موجودہ دور میں برصغیر کے ان علماء میں ہوتا ہے جنھیں ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان قدر واعتبار حاصل تھا۔ دارالمصنفین کا فیض یافتہ ہونے کی وجہ سے یوں تو انھیں تاریخ، سیر وسوانح، تفسیر وحدیث اور ادب میں بھی دست رس حاصل تھی، لیکن ان کی اصل جولاں گاہ فقہ تھی۔ جدید مسائل پر ان کی آراء کو اہمیت دی جاتی تھی۔ فقہی موضوعات پر ان کی تالیفات: اسلامی فقہ (۳ جلدیں) اجتہاد اور تبدیلیٔ احکام، فقہ اسلامی اور دورِ جدید کے مسائل، اسلامی قانونِ اجرت، جہیز کی شرعی حیثیت اور مسئلہ کفاءت وغیرہ کو علمی ودینی حلقوں میں قبول عام حاصل ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی نے دینی تعلیم کے لیے ایک ادارہ جامعۃ الرشاد کے نام سے قائم کرکے اس کے ماہ نامہ ترجمان 'الرشاد' کا اجرا کیا۔ اپنے سنجیدہ علمی و تحقیقی مضامین اور حالات حاضرہ، خاص کر ملک وملت کے مسائل پر بھرپور تبصرہ کے حامل 'رشحات' کی وجہ سے بہت کم عرصہ میں اس رسالہ کا شمار ملک کے باوقار رسائل میں ہونے لگا۔ مولانا مرحوم اس میں روز اول (۱۹۸۱ء) سے 'وفیات' کے مستقل کالم کے تحت مختلف شخصیات کی وفات پر 'تعزیت نامے' تحریر کرتے تھے۔ انہی تعزیت ناموں کو 'کاروان رفتگاں' کے عنوان سے مرتب کردیا گیا ہے۔ جن شخصیات کو اس کارواں میں جگہ ملی ہے وہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں علماء وفضلاء بھی ہیں اور دانش وران بھی۔ دینی مدارس کے بانیان اور ذمہ داران بھی ہیں اور دینی جماعتوں، تعلیمی انجمنوں اور ملّی تنظیموں کے سربراہان بھی۔ مفسرین، محدثین اور فقہاء بھی ہیں اور ماہرین تعلیم بھی۔ سیاست داں بھی ہیں اور حکم راں بھی۔ ان 'وفیات' کی تاریخی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ ان میں صرف ان شخصیات ہی کے احوال مذکور نہیں ہیں، بلکہ بیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کی اہم علمی و تعلیمی، سیاسی و سماجی، دینی و ادبی اور قومی و ملی سرگرمیوں کا ذکر بھی آ گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی مولانا مرحوم کی زندگی کی آخری دہائی میں ان سے بہت قریب تھے۔ الرشاد کی ادارت میں ان کا بھرپور تعاون کرتے تھے۔ ان کے ایماء پر ہی انھوں نے 'الرشاد' کا بائیس سالہ اشاریہ بڑی محنت سے مرتب کرکے شائع کیا۔ ان کی دل چسپی اور محنت سے اب یہ مجموعہ منظر عام پر آیا ہے۔ اس کی ترتیب زمانی ہے، البتہ آخر میں الف بائی ترتیب پر مبنی اشاریہ بھی شامل کردیا گیا ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم کی تحریروں کے مختلف مجموعے مرتب کرکے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ دعا ہے کہ یہ منصوبہ شرمندۂ تعبیر ہو اور مولانا مرحوم کی قیمتی تحریروں کا فیض عام ہو۔ امید ہے، علمی و ادبی حلقوں میں اس کتاب کو قبول عام حاصل ہوگا۔

(م-ر-ن)

خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۲۸)

☆ صدرِادارہ اورامیر جماعت اسلامی ہندمولانا سید جلال الدین عمری کی علمی خدمات کے تعارف پر مشتمل ایک ویب سائٹ انگریزی اور اردو میں تیار کی گئی ہے۔ اس کا افتتاح ۱۹/ اپریل ۲۰۰۸ء کو مرکز جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی میں مرکزی وزیرمملکت برائے امور داخلہ ڈاکٹر شکیل احمد کے ہاتھوں ہوا۔ مشہور دانش ور جناب سید حامد صاحب چانسلر جامعہ ہمدرد نے اس تقریب کی صدارت فرمائی۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت وایڈیٹر پندرہ روزہ ملی گزٹ مہمان خصوصی تھے۔ جناب سید سعادت اللہ حسینی رکن مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہندورکن مجلس منتظمہ ادارۂ تحقیق نے اس ویب سائٹ کا مظاہرہ کیا۔ اس موقع پر مولانا عمری کی علمی خدمات کے تعارف پر مشتمل، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی (رکن ادارہ) کی ایک تحریر بھی پڑھ کر سنائی گئی۔ جماعت اسلامی ہند کے مرکزی قائدین اور دیگر اہم شخصیات اس تقریب میں شریک تھیں۔ اس ویب سائٹ کا پتا یہ ہے: www.jalaluddinumari.com

اس مناسبت سے مولانا نے ایک مختصر تحریر لکھی تھی وہ خبرنامہ کے آخر میں دی جارہی ہے۔

☆ ۲۸-۳۰/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۹ھ، ۳-۵/ جون ۲۰۰۸ء میں مکہ مکرمہ میں رابطہ عالم اسلامی کی جانب سے عالمی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کا مرکزی موضوع بین مذاہب مکالمہ تھا۔ اس میں دنیا بھر سے پانچ سو سے زائد مندوبین شریک ہوئے۔ ہندوستان سے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے جن حضرات کو مدعو کیا گیا تھا، ان میں مولانا سید جلال الدین عمری اور جناب اعجاز احمد اسلم سکریٹری جماعت اسلامی ہند وایڈیٹر ہفت روزہ ریڈینس بھی تھے۔ اس مناسبت سے مولانا عمری نے تقریباً دو ہفتے سعودی عرب میں گزارے اور وہاں کے مختلف شہروں ریاض، دمام، مکہ مکرمہ، مدینہ منوراور جدہ میں دینی وتحریکی حلقوں میں آپ کے متعدد خطبات ہوئے۔

اسی طرح کی ایک عالمی اسلامی کانفرنس دوحہ (قطر) میں ۱۴-۱۶/ جمادی الاخری ۱۴۲۹ھ- ۱۹-۲۱/ جون ۲۰۰۸ء میں منعقد ہوئی۔ اس میں بھی مولانا نے اپنے رفقاء جناب صدیق حسن صاحب نائب امیر جماعت اسلامی ہنداور جناب اعجاز احمد اسلم صاحب کے ساتھ شرکت کی اور 'اتحاد امت: اہمیت اور تقاضے' کے موضوع پر خطاب کیا۔

☆ فقہ اسلامی کے مختلف پہلوؤں پر مولانا عمری کے مقالات تحقیقات اسلامی اور ملک

کے دیگر مجلّات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ان میں بہت سے مقالات ان کی کتابوں کا جزء بن گئے ہیں۔جو مقالات کتابوں میں شامل نہیں ہوسکے ہیں ان کا ایک مجموعہ 'فقہی مباحث' کے عنوان سے تیار کیا گیا ہے جس کی جلد اشاعت متوقع ہے۔

دینی و دعوتی موضوعات پر مولانا کی متعدد مختصر تحریریں رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ان کے علاوہ ان کے متعدد خطابات کو بھی ضبط تحریر میں لاکر رسائل میں یا کتابچوں کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ ایسے مضامین کا ایک مجموعہ مولانا کی نظر ثانی کے بعد 'دعوت و تربیت-اسلام کا نقطۂ نظر' کے عنوان سے ابھی حال میں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔صفحات ۱۳۶، قیمت =/۵۰ روپے۔

مولانا عمری کی تصانیف کے تراجم کا سلسلہ بحمداللہ جاری ہے، حسب ذیل کتابچوں کے ہندی ترجمے جلد ہی شائع ہوئے ہیں۔(۱) دولت میں خدا اور بندے کا حق، (۲) اللہ کا دین نوجوانوں سے کیا چاہتا ہے؟ (۳) خدا کی غلامی بندے کی معراج، (۴) اپنے خاندان کو خدا کے عذاب سے بچایئے۔

☆ مولانا سلطان احمد اصلاحی، جو ادارۂ تحقیق کے سینیر رکن تھے، اب ادارہ سے سبک دوش ہوگئے ہیں۔ ان کے اعزاز میں ایک الوداعی تقریب ۱۴/ اپریل ۲۰۰۸ء کو ادارہ کے آڈیٹوریم میں صدر ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کی صدارت میں منعقد ہوئی۔اس میں صدر ادارۂ علوم القرآن علی گڑھ و ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، سابق امیر جماعت اسلامی ہند پروفیسر محمد عبدالحق انصاری، مشہور محقق و دانش ور اور ماہر اقتصادیات پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی نے اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا اور مولانا اصلاحی کی خدمات کی ستائش کی۔صدر ادارہ مولانا عمری نے ادارہ میں مولانا اصلاحی کی طویل رفاقت کو یاد کرتے ہوئے فرمایا کہ اگرچہ مولانا کا رسمی تعلق ختم ہو رہا ہے، لیکن غیر رسمی تعلق ان شاء اللہ آئندہ بھی باقی رہے گا۔اس موقع پر رکن ادارہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے مولانا اصلاحی کی علمی خدمات کا مختصر تعارف پیش کیا۔

☆ ادارۂ تحقیق کے اسٹاف میں الحمدللہ دو افراد کا اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر مفتی محمد شمیم اختر قاسمی کا تقرر بحیثیت محقق و مصنف کیا گیا ہے۔ موصوف دینی تعلیم کے مشہور ادارہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں اور ابھی حال میں انھیں شعبۂ دینیات (سنّی) مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے ۔ ڈاکٹر محمد احمد فلاحی کا تقرر بحیثیت منتظم کیا گیا

ہے۔موصوف نے شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ہے اور گزشتہ پانچ سال سے جماعت اسلامی ہند کی تصنیفی اکیڈمی سے وابستہ رہے ہیں۔ یہ تقرریاں ۱۴/ اپریل ۲۰۰۸ء کو ایک انٹرویو کے ذریعے کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان حضرات کی صلاحیتوں سے ادارۂ تحقیق کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو اور امت کو فیض پہنچے۔

☆ رکن ادارہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے شام کے مشہور عالم ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی کی کتاب **فقه السيرة النبوية** کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی نے 'سیرت رسول- دروس ونصائح' کے نام سے شائع کیا ہے۔ پاکستان میں اس ترجمہ کو نشریات لاہور نے 'دروس سیرت' کے عنوان سے شائع کر دیا ہے۔ ہندوستانی ایڈیشن میں کسی قدر تلخیص کر دی گئی تھی، جب کہ پاکستانی ایڈیشن مکمل ہے۔ اس کے علاوہ اس میں اس کتاب کی احادیث وروایات پر علامہ البانی کے استدراکات کا ترجمہ بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ندوی نے ڈاکٹر محمد علی الہاشمی (سعودی عرب) کی کتاب **شخصية المسلم، كما يصوغها الاسلام في ضوء الكتاب والسنة** کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ بہت پہلے ہندوستان پبلی کیشنز دہلی سے 'اسلامی زندگی کتاب وسنت کی روشنی میں' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ پاکستان کے کئی ناشرین نے اسے نام بدل بدل کر شائع کیا ہے۔ حال میں دارالاندلس لاہور کی طرف سے 'مثالی مسلمان کتاب وسنت کی روشنی میں' کے نام سے اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔

(ویب سائٹ کے افتتاح کے موقع پر مولانا سید جلال الدین عمری نے حسب ذیل تحریر کے مواد کو زبانی پیش کیا تھا۔ اب یہی تحریر یہاں پیش کی جارہی ہے)

محترم صدر مجلس، مہمان خصوصی، جناب شکیل احمد خاں صاحب وزیر مملکت برائے امور داخلہ، ذمہ داران جماعت اور برادرانِ محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

یہ اللہ تعالیٰ کا محض فضل وکرم ہے کہ اس عاجز کو آغاز شباب ہی سے تحریک اسلامی ہند سے وابستگی کی سعادت حاصل رہی اور اس کے ذریعہ اپنی اصلاح کی فکر کے ساتھ، دین کی خدمت، دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کی کوششوں میں شرکت کے مواقع نصیب ہوتے رہے۔ تحریک اسلامی کے علاوہ دوسرے ملی اداروں اور تنظیموں سے بھی تعلق رہا اور اب بھی یہ تعلق قائم ہے۔ بسا اوقات انتظامی امور بھی انجام دینے پڑے، لیکن اس پورے عرصہ میں اصل توجہ اسلام کے مطالعہ کی طرف رہی۔ اس کے بعض پہلوؤں کو نسبتاً تفصیل سے سمجھنے کا موقع ملا۔ تحریر کا ذوق شروع سے رہا۔

ایک مرحلہ میں پانچ سال تک اس کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ کی ذمہ داری بھی اس کے آغاز ہی سے اس عاجز کے دوش ناتواں پر رہی۔ اب اس علمی وفکری مجلّہ نے اپنی عمر کے ۲۶ر سال پورے کر لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اسے علمی دنیا میں ایک وقار اور اعتبار حاصل ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ اسلامی ذوق رکھنے والے اصحاب قلم کا ایک سرکل اس کے ذریعہ وجود میں آ گیا ہے۔ اس عاجز کے مضامین ماہ نامہ تجلی دیوبند، ماہ نامہ برہان دہلی، ماہ نامہ الفرقان لکھنؤ، ماہ نامہ فران کراچی، ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور، ماہ نامہ میثاق لاہور، ماہ نامہ راہِ اعتدال عمر آباد اور بعض دوسرے رسائل میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔

اسلام کا اس کے اصل مآخذ سے کسی قدر تفصیل سے مطالعہ کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اسلام کی حقانیت پر ایمان ویقین میں اضافہ ہوا اور یہ حقیقت سامنے آئی کہ دور حاضر کو اسلام کی رہنمائی کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح اپنے نزول کے وقت تھی۔ وہ ایک ابدی اور دائمی دین ہے۔ اس کے بتائے ہوئے راستے ہی سے آج کا سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی فساد دور ہوسکتا ہے۔ اسلام انسان کے مادی مسائل بھی حل کرتا ہے اور اسے روحانی سکون بھی فراہم کرتا ہے۔ میری جملہ تصنیفات، مضامین اور مقالات اسی حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان میں اسلام کو دنیا کے لیے ایک متبادل نظام فکر وعمل کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ محض اللہ کا فضل وکرم ہی ہے کہ اس نے ان بے جان تحریروں کو مقبولیت عطا کی۔ ہر کتاب کے متعدد ایڈیشن نکلے۔ بعض کے تراجم بھی انگریزی، عربی اور ملک کی علاقائی زبانوں میں ہوئے۔

ایک عرصہ سے دوست احباب کی خواہش تھی کہ ان تحریروں کو انٹرنیٹ پر آنا چاہیے۔ بعض دوستوں نے اپنے پسندیدہ انٹرنیٹ پر چند ایک تحریریں ڈال رکھی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ چند ایک عزیزوں کی کوشش سے آج میرے نام سے یہ ویب سائٹ شروع ہورہی ہے۔ امید ہے، اس کے مواد میں اضافہ ہوگا اور نئے سوالات وجوابات کا سلسلہ بھی جاری ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس سے وہ فائدہ حاصل ہو جس کی توقع کی جارہی ہے۔

میں صدر مجلس محترم سید حامد صاحب، مہمان خصوصی جناب شکیل احمد خاں صاحب وزیر مملکت برائے امور داخلہ، محترم مولانا سراج الحسن صاحب، محترم ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب سابق امراء جماعت، دیگر ذمہ دارانِ جماعت اور سب ہی دوستوں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس پروگرام میں شرکت کی زحمت کی اور ہمت افزائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے نوازے۔